دولت آصفیہ
اور
حکومت برطانیہ

سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

ناشران

سیّد علی شبّر حاتمی بی ایس سی (عثمانیہ)

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

قیمت

پہلا ایڈیشن — ایک ہزار — ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

دوسرا ایڈیشن — ایک ہزار — جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سر جان میلکم کے بقول دولت آصفیہ پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکز ثقل ہے
سلطنت کے اندر ایک سلطنت جو تقریباً ۱۳ ملین انسانوں پر حکمران ہو جس کے حدود
کی وسعت یورپ کی جلیل القدر سلطنتوں کے برابر ہو جس کو اپنی رعایا پر کامل حاکمیت
مطلقہ حاصل ہو ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کی اہمیت کو آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جاسکے
ایک ایسی طاقتور سلطنت نے کس طرح برطانوی حمایت (Protection) کو
قبول کرلیا اور اپنی خارجی آزادی اور فوجی استقلال کو اپنے مساوی الدرجہ بلکہ ابتداءً
باجگذار حلیف کے سپرد کر دینے پر راضی ہو گئی ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو قدرتی طور پر
پیدا ہوتے ہیں اسی طرح ڈیڑھ صدی سے زیادہ کے حلیفانہ تعلقات میں دونوں سلطنتوں کے
درمیان کس قسم کے تعلقات رہے ہیں ؟ اور دونوں نے ایک دوسرے کی دوستی کا
حق کیونکر ادا کیا ہے ؟ یہ بھی اہم اور ضروری سوالات ہیں جہاں تک دولت آصفیہ کا
تعلق ہے تاریخ پر اس کی دوستانہ وفاداری کے واقعات نمایاں موجود ہیں ٹیپو
کی لڑائیوں سے لیکر آج تک سلطنت انگلیشیہ پر کوئی ایسا نازک موقع نہیں آیا جس میں
آصفجاہی تلوار اور روپیہ نے اس کی مدد نہ کی ہو اسکا اعتراف خود برطانی مدبرین نے

بھی ہمیشہ کھلے دل سے کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں سلطنت برطانیہ نے اپنے "یار وفادار" کو دوستی کا کیا بدلہ دیا؟ اس کا جواب اکثر سکوت سے دیا گیا ہے تاریخ اپنے سینہ میں معلومات کا ایک وافر ذخیرہ رکھتی ہے مگر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی۔

دکن کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلو خاص طور پر دلچسپ ہے۔ میں ایک عرصہ سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس پر ایک مفصل کتاب لکھوں۔ چنانچہ اس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا تھا لیکن حالات نے اس ارادہ کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اب ایک خاص موقع پر اخبار "المجمعیۃ" کے لئے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تو تمام پچھلی معلومات کا ہجوم ہو گیا اور اجمال و اختصار کی انتہائی کوشش کرنے کے باوجود دامن بحث و بیان کسی طرح سمٹ نہ سکا۔ آخر مجبوراً اس مضمون کو چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ یہی رسالہ ایک کتاب کی صورت اختیار کر لے گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء

سنہ ۱۹۲۸ء کا زمانہ ہے، لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند اگرچہ اپنا دور فرمان دہی ختم کر کے ہندوستان سے واپس تشریف لے جا چکے ہیں۔ ان کے تیر اقتدار کے زخمی کراچی کے مشہور قیدی قفس کراچی سے باہر قید خانہ ہندوستان میں تشریف رکھتے ہیں۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے مابین اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ مابہ الاختلاف بنا ہوا ہے اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ حضرات اسکی تفصیلات سننے کے مشتاق ہیں۔

یہ تھا وہ وقت جبکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کتاب تالیف فرمائی تھی، مولانا نے اسے اس وقت خود چھپوایا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے نسخے ختم ہو گئے اور لوگوں کا اشتیاق بدستور باقی رہا۔ یہاں تک کہ ۱۳ سال کی مدت مدیدہ گزر گئی اور لوگ ایک ایسی کتاب کی تلاش میں رہے جس سے دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے دو صد سالہ تعلقات پر روشنی پڑ سکے۔

ہم نے اس قسم کی ایک کتاب کی ضرورت کا اندازہ لگانے کے بعد یہ مناسب نہ سمجھا کہ کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر تالیف کرائی جائے کیونکہ

مولانا موصوف کے قلم کی خوبی پیدا کرنا دوسروں کے لئے آسان کام نہ تھا اور دوسری طرف اہل بصیرت حضرات کا اتفاق ہے کہ اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر دوسری نہیں ہو سکتی۔

ہم نے اس کی دوبارہ اشاعت کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے اجازت چاہی اور ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ مولانا موصوف نے ہمیں اس کی اجازت مرحمت فرما کر ممنون فرمایا۔

سامان طباعت خصوصاً کاغذ اس زمانہ میں جس قدر گراں بلکہ کمیاب ہو گیا ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ہمیں اس گرانی کا قصہ آپ کو سنانا منظور نہیں لیکن بے انتہا افسوس ہے کہ اس کتاب کو جس قدر کم قیمت پر ہم آپ کے ہاتھوں تک پہنچانا چاہتے تھے اتنی قیمت پر پہنچانا ممکن نہیں رہا پھر بھی آپ یقین فرمائیں کہ جس قدر ہمارے امکان میں تھا ہم نے اس میں کسی طرح کوتاہی نہ کی۔

ناشران

سید علی شبر حاشمی
محمد اقبال سلیم گاہندری

فہرست

انگریزی تعلقات کی ابتداء

سلطنت آصفیہ سے انگریزی تعلقات کی ابتداء حضرت مغفرت مآب آصفجاہ اول ہی کے عہد میں ہو چکی تھی۔ اگرچہ وہ تعلقات وددوستوں کے سے نہ تھے بلکہ ایک فریادی اور ایک فریاد رس کے سے تھے۔ اول اول انگریز اپنی تجارت کی حفاظت اور ترقی کے لئے اس سلطنت کے ماتحت عہدہ داروں سے ملکر کام لے لیا کرتے تھے۔ مگر جب ۱۷۴۶ء میں فرانسیسیوں نے انگریزوں سے مدراس چھین لیا اور کرناٹک کے آصفجاہی گورنر انورالدین خاں نے انگریزوں کی مدد نہ کی تو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے گورنر نے نواب آصفجاہ سے فریاد کی۔ نواب نے اس فریاد کو توجہ کے ساتھ سنا اور انورالدین خاں کو حکم دیا کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں سے جو کچھ چھین لیا ہے وہ انگریزوں کو واپس دلوا دیں۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد نواب آصفجاہ کا انتقال ہوگیا ان کی جگہ ان کے دوسرے لڑکے ناصر جنگ مسند نشین ہوئے۔ مگر مظفر جنگ نے (جو نواب آصفجاہ کے نواسے تھے) ان کے حق کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور ایک دوسرے

مدعی حسین دوست خاں عرف چندا صاحب سے جو ارکاٹ کی حکومت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اتحاد کر کے ناصر جنگ کو بیدخل کرنے کی کوشش کی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پانڈیچری میں ڈوپلے جیسا داہیئہ سیاست فرانسیسی عملداری کا حاکم اعلیٰ تھا اس نے دکن میں اپنے اثر کو بڑہانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان دونوں مدعیوں کی حمایت کے لئے مستعد ہو گیا۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ مظفر جنگ کی مدد پر فرانسیسی قوت کو دیکھکر ناصر جنگ کی مدد کیلئے انگریز کھڑے ہو گئے لیکن اس زمانہ میں انگریزوں کی کوئی ایسی طاقت نہ تھی کہ صوبیدار دکن اور ان کی مدد کا طالب ہوتا یا انکی مدد کو خاطر میں لاتا ممکن ہے کہ ایک آدھ انگریز پلٹن نواب کے ساتھ ہو گئی ہو۔ مگر دکن کے مورخین نے ان کو اتنی بھی اہمیت نہ دی کہ ان کا ذکر بھی کرتے۔

بہر حال ناصر جنگ اور مظفر جنگ کا مقابلہ ہوا مظفر جنگ قید ہو گئے۔ اور ناصر جنگ فرانسیسیوں کی تادیب کیلئے پانڈیچری پر بڑھے راستہ میں فرانسیسیوں نے لشکر دکن پر شب خون مارا ہنگامہ اضطراب میں کرنول کے نمک حرام افغانوں نے ناصر جنگ کو شہید کر دیا اور اس طرح مظفر جنگ دکن کے فرمانروا ہو گئے۔ مظفر جنگ کی اس کامیابی نے افغانوں اور فرانسیسیوں کا اثر دربار دکن میں بہت بڑھا دیا لیکن ان دونوں قوموں میں جنج و باہم رقابت پیدا ہو گئی۔ فرانسیسی عنصر کا سردار موسیو بوسی تھا اور افغانوں کا سردار ہمت بہادر خاں۔ دونوں فوجوں میں لڑائی ہو گئی اور اس کشمکش میں مظفر جنگ اور ہمت بہادر خاں دونوں مارے گئے۔

فرانسیسی اثر کا زوال

اس کے بعد نواب آصفجاہ کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ مسند آرائے سلطنت

بوسی (Bussy) اور اس کی فرانسیسی فوج کا اثر اسوقت حیدرآباد میں پورے عروج پر تھا۔ بوسی کو سیف الدولہ عمدۃ الملک غضنفر جنگ بہادر کا خطاب ہفت ہزاری منصب مع علم و نقارہ و ماہی مراتب دیا گیا تھا۔ اور صلابت جنگ کی سفارش پر شاہ دہلی کی جانب سے اسکو خلعت و سرپیچ مع فیل خاصہ مرحمت ہوا تھا۔ اسکی فوج کی معاش کے لئے سرکارات سیکاکول راجبندری مصطفی نگر اور مرتضی نگر گنتور بطور جاگیر دیئے گئے تھے اگر وہ دانائی و فرزانگی سے کام لیتا تو صوبہ دار دکن کی تائید فرانسیسیوں کے حق میں حاصل کر لیتا اور شاید ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن اس نے اپنی کوتاہ فہمی سے یہ سمجھا کہ یہی وقت دکن پر قبضہ جمانے کے لئے موزوں ہے چنانچہ اس نے سلطنت کے معاملات میں مداخلت شروع کی اس کے دیوان رومی خاں نے جسے حیدر جنگ کا خطاب دیا گیا تھا۔ خود مدار المہام سلطنت نواب صمصام الدولہ کے ساتھ مساوات کا دم بھرنا شروع کیا اور ان دونوں نے اتنی سرکشی اختیار کی کہ آخر صلابت جنگ اور صمصام الدولہ ان سے برگشتہ خاطر ہو گئے اور انہیں خدمت سے برطرف کر دیا اس برطرفی سے غضبناک ہو کر انہوں نے حیدرآباد میں فتنہ عظیم برپا کر دیا۔ چار محل۔ چار مینار۔ اور حیدر محل پر توپیں لگا دیں۔ داد محل پر مورچہ بنایا اور شہر کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ صلابت جنگ نے یہ رنگ دیکھکر اسوقت کو نرمی سے ٹال دینا مناسب سمجھا۔ بوسی کو اس کی جگہ بحال کر دیا اور حیدر جنگ کو ورنگل ہکھم اور ملنگور کی تعلقہ داری سپرد کی لیکن اس سے ان دونوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک فوجی سازش کر کے صمصام الدولہ اور میر حسین خاں کو گرفتار کر لیا اور نواب میر نظام علیخاں ولیعہد سلطنت کو

کو بھی قلعہ گولکنڈہ میں قید کر دینے کی تدبیر شروع کر دی۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ اس سے سلطنت کا عین وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ چنانچہ میر نظام علیخاں نے حیدر جنگ کو پکڑوا کر قتل کرا دیا۔ اور بوسی کے دوسرے ساتھی ابراہیم گارڈی کو توڑ لیا۔ اس طرح بوسی کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اسکو حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا پڑا۔

انگریزی اثر کی ابتداء

یہ حیدرآباد میں پہلی مرتبہ فرانسیسی اثر کے زوال کے اسباب ہیں۔ اسی زمانہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ ہوئی اور کرنل فورڈ (Forde) اس علاقہ میں گھس آیا جو سرکار نظام سے فرانسیسی فوجوں کی معاش کیلئے دیا گیا تھا۔ صلابت جنگ نے اپنے حدود سلطنت میں اس تجاوز بیجا کو دیکھکر انگریزوں کی تادیب کیلئے خود جانے کا قصد کیا لیکن انگریز سمجھتے تھے کہ صوبہ دار دکن سے بگاڑ کر انکی خیر نہیں ہے اس لئے انہوں نے خود آگے بڑھ کے صلح کی درخواست کی۔ اور ۱۷۵۹ء (۱۱۷۳ھ) میں پہلا عہدنامہ عمل میں آیا جس کی رو سے نظام دکن نے سرکار مسولی پٹم سرکار نظام پٹم اور اضلاع کونڈاویڑ دوا کلیر انگریزی کمپنی کو انعام میں دیئے اور وعدہ کیا کہ اپنی ریاست سے فرانسیسی فوجوں کو نکالدیں گے۔

اس عہدنامہ پر ابھی عملدرآمد نہ ہوا تھا کہ نواب میر نظام علیخاں آصفجاہ ثانی نے نواب صلابت جنگ کو معزول کر دیا اور خود عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی اس انقلاب کے بعد نواب غفراں مآب اپنی ریاست کے معاملات کی درستی میں

مشغول تھے کہ انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں قانون کے بالکل خلاف بالا بالا شاہ
دہلی سے شمالی سرکاروں کی سند حاصل کرلی (حالانکہ دو سال پہلے معاہدہ پیرس میں وہ
خود تسلیم کر چکے تھے کہ یہ علاقہ نظام کی ملک ہے) اور اسکے بعد جنرل کیلوڈ (
Calliaud) کی قیادت میں ایک فوج بھی بھیجدی تاکہ اس علاقہ پر قبضہ کرلے۔
یہ قانون بین الملل کی ایک کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی اس سے ناراض ہو کر نواب نے
کرناٹک پر دباؤ ڈالا جہاں انگریزوں کے اغواء سے نواب محمد علیخاں (ابن نواب
انورالدین خاں) خود مختار ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے پہلے تو کرنل کیمبل کے زیر
قیادت مزاحمت کی مگر بعد میں نواب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھکر خائف ہو گئے
اتنے بڑے فرمانروا سے لڑنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ دوسرے حیدر علی کے ساتھ
نظام دکن سے بھی بگاڑ لینا ان کے حق میں سخت خطرناک تھا اس لئے فورٹ
سینٹ جارج کی پریسیڈنسی سے جنرل کیلوڈ صلح کی استدعا لیکر حیدرآباد بھیجا گیا
اور نومبر ۱۷۶۶ء میں اس نے سرکار نظام کے ساتھ ایک جدید عہدنامہ مرتب کیا اس
عہدنامہ کی رو سے انگریزوں نے شمالی سرکاروں کی سند ان کے قانونی مالک سے حاصل
کی اور راجمندری سیکاکول ایلورا اور مصطفیٰ نگر کی سرکاروں کے عوض ۷ لاکھ روپیہ
سالانہ خراج دینا قبول کیا اور مرتضیٰ نگر کے متعلق یہ طے ہوا کہ نواب بسالت جنگ
(نواب آصفجاہ ثانی کے چھوٹے بھائی) کی زندگی میں یہ علاقہ ان کے زیر تصرف رہیگا
بعد میں وہ بھی انگریزوں کو مل جائے گا۔ اور اس کے عوض انگریزی کمپنی ۲ لاکھ
سالانہ خراج سرکار نظام کو دے گی۔ اس کے مقابلہ میں انگریزوں نے عہد کیا کہ
وہ ہر ضرورت کے موقع پر سرکار نظام کی مدد کے لئے ایک فوج مستعد رکھیں گے

اس فوجی امداد کا خرچ اگر شمالی سرکاروں کے خراج سے کم ہوگا تو اسے رقم خراج میں سے وضع کر کے باقی ماندہ رقم سرکار میں داخل کی جائے گی۔ اور اگر خراج سے زیادہ ہوگا تو زائد رقم کی ذمہ دار خود کمپنی ہوگی۔ یہ فوجی خدمات کا پہلا دام تھا جس میں نظام دکن کو پھانسا گیا۔ بعد میں اس نے جو جو شکلیں اختیار کی ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

حیدر علی کے خلاف اتحاد

مذکورہ عہدنامہ کے مطابق نظام دکن کی خدمت کیلئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھنا انگریزوں کا فرض تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب حیدر علی کی قوت سے انگریزی مقبوضات کو خطرہ لاحق ہوا تو یہ فوج اگست ۱۷۶۷ء میں حیدرآباد سے واپس بلائی گئی۔ اور اسے انگریزی مقبوضات کی حفاظت پر لگا دیا۔ نواب آصفجاہ ۱۷۶۶ء کے عہدنامہ کی پابندی کرتے ہوئے حیدر علیخاں کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنے پر مستعد ہو چکے تھے مگر ان کی اس بدعہدی کو دیکھکر ناراض ہو گئے اور ان کی مدد سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر رکن الدولہ مدارالمہام نے حیدر علی کی سفارش کی۔ خود حیدر علی نواب کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا اور جب نواب بازدید کیلئے اس کے ہاں گئے تو جلو خانے تک آکر آداب مجرا بجالایا ۱۵ ہزار روپئے نقد اور دو ہزار پتلیاں سونے کی نذر میں پیش کیں چبوترہ زرین پر بیٹھا کر بٹھایا۔ جواہر کے خوان، پارچہ و پوشاک، دو عدد فلادہ فیل اور دو تین توپیں گذرانیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اگر سلطنت دکن اور ریاست میسور کا دائمی اتحاد ہو جاتا تو کم از کم جنوبی ہند پر اسلامی سلطنت از سر نو مستحکم ہو جاتی مگر مشیت الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ نواب

آصفجاہ کی واپسی پر دربار کا رنگ پھر بدلا۔ نواب والاجاہ محمد علیخاں والی کرناٹک نے جو انگریزوں کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ چکا تھا، حاضر ہو کر نہ معلوم کیا پٹی پڑھائی کہ نواب غفراں مآب کا مزاج پھر حیدر علی سے منحرف اور انگریزوں کی جانب منعطف ہو گیا اس کے بعد ہی رکن الدولہ مدراس بھیجے گئے اور وہاں فروری ۱۷۶۸ء میں ایک عہدنامہ مرتب ہوا جس کی رو سے نواب آصفجاہ نے کرناٹک کی دیوانی ۷ لاکھ روپے سالانہ خراج کے عوض انگریزوں کے سپرد کی۔ نواب کرناٹک کے معاملات میں مداخلت سے دست برداری لکھی۔ اور انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ سپاہیوں کی دو پلٹنیں گولندازوں کی کافی تعداد سمیت، نواب کی خدمت میں دیں گے جس کا خرچ نواب کو دینا ہو گا۔ مگر یہ فوج ایسی طاقتوں کے ساتھ استعمال نہ کی جائیگی جن سے انگریزی کمپنی کی دوستی ہو۔

یہ اسی سبسیڈیری الائنس (Subsidiary Alliance) کی بنیاد تھی جس نے بعد میں ترقی کر کے ریاست کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔ افسوس اس وقت کوئی ایسا صاحب نظر سیاست داں موجود نہ تھا جو اس حقیقت کو سمجھتا کہ سلطنت کا استحکام اسکی اپنی طاقت پر منحصر ہوتا ہے نہ کہ کسی حلیف کی مدد و اعانت پر

سرکار گنتور پر ناجائز تصرف

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۷۶۶ء میں سرکار گنتور کے متعلق کمپنی سے یہ عہد ہوا تھا کہ بسالت جنگ کی زندگی تک یہ علاقہ انکی جاگیر میں رہے گا۔ اسکے بعد پھر کمپنی کو مل جائے گا لیکن انگریز ملک گیری کی ہوس میں بیچین ہو رہے تھے

بسالت جنگ کے مرنے تک صبر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا اور انہوں نے شہزادہ کو
حیدر علی کے خطرہ سے ڈرا کر ۱۷۷۹ء میں اس سے سرکار گنتور کا قبضہ حاصل کر لیا
اور اسے نواب کرناٹک کو دس سال کے پٹہ پر بھی دے دیا۔ یہ نہ صرف ایک صریح
بد عہدی تھی بلکہ ایک حلیف کی رعایا سے ناجائز ساز باز کرنا اور اس کے ملک پر
بیجا تصرف کرنا تھا جس کو نظام ایک معاندانہ فعل قرار دینے میں حق بجانب
تھے۔ انہوں نے اس حرکت پر سختی کے ساتھ احتجاج کیا اور احتجاج کو موثر بنانے
کے لئے فرانسیسی فوج کو پھر ملازم رکھ لیا۔ اس معاملہ کی خبر کلکتہ پہونچی تو سخت
اضطراب پیدا ہو گیا۔ گورنر نے نومبر ۱۷۷۹ء میں نواب کو ایک طویل معذرت نامہ
لکھا خود کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس معاملہ کی تحقیقات کی اور آخر نواب کو
خوش کرنے کے لئے نہ صرف سرکار گنتور واپس کی گئی بلکہ سرولیم رمبالڈ
(Sir W. Rumbald) گورنر مدراس کو اسکی کونسل کے ارکان سمیت برطرف کر دیا گیا

شمالی سرکار کی واپسی کا مطالبہ اور اس کا حشر

بسالت جنگ کے انتقال کے بعد ۱۷۸۲ء میں کمپنی کی طرف سے مسٹر
جانسن کو وکیل بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا تاکہ سرکار گنتور کی حوالگی کا مطالبہ کرے
اس زمانہ میں نواب کو اپنی پہلی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور انہوں نے ملک دیگر
اجنبی طاقتوں سے فوج رکھوانے کے انجام کو سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انگریزی وکیل کے
سامنے انہوں نے تجویز پیش کی کہ کمپنی شمالی سرکار ان کو واپس کر دے اور اس کے
عوض سرکار نظام نہ صرف پیشکش کا بقایا معاف کر دیگی بلکہ ایک کروڑ روپیہ

نقد بھی کمپنی کو دے گی۔ اس کے ساتھ[۱] نواب غفران مآب نے کرناٹک کی واپسی کے لئے بھی ایسی ہی تجاویز پیش کی تھیں۔ مسٹر جانسن نے ان تجاویز کو پسند کیا اور سپریم گورنمنٹ کو ان کی منظوری کے لئے لکھا لیکن وہاں سے سختی کے ساتھ انہیں رد کر دیا گیا اور اس قصور میں کہ غریب جانسن نے ان تجاویز کو سنا بھی کیوں؟ اسے منصب وکالت سے برطرف کر دیا گیا۔[۱]

سرکار گنتور کی باقاعدہ تفویض

۱۷۸۸ء میں لارڈ کارنوالس نے کیپٹن کنوے (Kenoaway) کو پہلی مرتبہ ریزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا اور اسے شمشیر جنگ کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ اس مرتبہ سرکار گنتور کی تفویض کا مطالبہ صرف زبانی ہی نہیں پیش کیا گیا۔ بلکہ سلطنت آصفیہ[۲] کی سرحدوں پر فوج کا اجتماع بھی کیا گیا تاکہ اگر نظام کچھ پس و پیش بھی کریں تو انہیں فوجی خدمات کے عوض ملک دینے کی سزا دی جائے۔ اب نظام کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ خود اپنا ملک دے کر فوج رکھوانے کا کیا انجام ہوتا ہے مگر اس کا تدارک اب ان کے بس کا نہ تھا۔ مجبوراً انہیں قدرتی نتائج

Our Faithfull Ally the Nizams p. 36.

۲ھ اس مقام پر حکومت نظام نے روپیہ ۲۶ لاکھ کے صرف سے ایک عظیم الشان کوٹھی انگریزی کلاہ کے قیام کیلئے بنوا دی تھی مگر اس جان نثاری کے جرم میں ریاست کو یہ سزا دی گئی کہ نہ صرف اس عمارت پر بلکہ اس کے اردگرد شہر حیدرآباد کے ایک اچھے خاصہ حصہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا چنانچہ حیدرآباد میں ریزیڈنسی کا ایک بڑا محلہ انگریزی تصرف میں ہے (تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۳۴۹)

۳ھ Our Faithfull Ally p. 37.

کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔ اور شمالی سرکار کی واپسی کے خیال سے ہاتھ دھو کر اپنے ملک کے ایک اور حصہ کی علیحدگی کو گوارا کرنی پڑی۔

اب تک کمپنی نے اس ملک کا پیشکش بھی ادا نہیں کیا تھا جو ۱۷۶۶ء اور ۱۷۶۸ء کے معاہدوں کی رو سے اس کے سپرد کیا گیا تھا یہ رقم ۶۷۴۹۳۳۳ روپئے تک پہنچ چکی تھی۔ نظام نے اس کا مطالبہ کیا۔ لیکن کمپنی نے صرف ۹۱۶۶۶۵ روپئے پیش کئے اور ۵۸۳۲۶۶۷ روپئے اس بہانہ سے کاٹ لئے کہ یہ بسالت جنگ کے انتقال ستمبر ۱۷۸۲ء سے لیکر سرکار گنتور کی تفویض ستمبر ۱۷۸۸ء تک کا ہرجانہ ہے[1]

میر عالم کی سفارت

۱۷۸۸ء میں بعض معاملات کے تصفیہ کے لئے سرکار نظام کی طرف سے ایک سفارت کلکتہ بھیجی گئی جو عاقل الدولہ نظام یار جنگ میر عبدالعزیز خاں غلام نبی خاں اور میرزا ابو تراب خاں سے مرکب تھی اور میر عالم اس کے صدر تھے۔ اس سفارت کی گفت و شنید سے ایک اور عہد نامہ عمل میں آیا جو لارڈ کارنوالس کے ایک خط کی صورت میں ہے اس میں لارڈ کارنوالس نے اس امر کی تصریح کی کہ جو فوج نواب آصفجاہ کے خرچ پر رکھی گئی ہے وہ ہر ایسے موقع پر ان کی خدمت کیلئے حاضر رہے گی جبکہ وہ اسے طلب کریں لیکن اسے پیشوا، ٹیپو سلطان، مادھو راؤ سندھیا، نواب ارکاٹ اور راجایان تنجاور و ٹراونکور کے خلاف

---

[1] Our Faithfull Ally p. 37.

استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ فوج صرف ٹیپو سلطان کے مقابلہ کے لئے رکھی گئی تھی۔ کیونکہ نظام کے تمام ہمسایہ رئیسوں اور نوابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد صرف ایک ٹیپو سلطان ہی باقی رہ گیا تھا۔

اس خط میں یہ بھی تصریح کر دی گئی تھی کہ آئندہ شمالی سرکاروں کے مسئلہ کو چھیڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے یعنی یہ علاقہ جو سلطنت دکن سے علیحدہ کیا جا چکا ہے اب کسی حال میں اصل مالک کو نہ ملے گا۔

ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ٹیپو سلطان کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی اور انگریز سمجھتے تھے کہ اگر اس اولو العزم سپاہی کو دس پانچ برس کی بھی مہلت ملگئی تو پھر کم از کم جنوبی ہند میں ان کا قدم ٹکنا محال ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے یہ عزم کیا کہ اس سرچشمہ کو طوفان بننے سے پہلے ہی بند کر دینا چاہیے لیکن ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں کے بس کا نہ تھا۔ نظام اور مرہٹوں کی امداد کے بغیر اس کا زور توڑنا ناممکن تھا اور کم از کم نظام کو ان کے ایک ہم مذہب رئیس کے مقابلہ میں شرکت جنگ پر آمادہ کرنا مشکل تھا لہٰذا اس کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ ایک طرف ٹیپو کی اولو العزمیوں کو خود نظام کے لئے خطرناک ظاہر کیا گیا اور دوسری طرف ان کے سامنے یہ فائدہ کی صورت پیش کی گئی کہ اگر ٹیپو کو مغلوب کر لیا گیا تو ملک اتحادیوں پر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ یہ تدبیر کارگر ہو گئی۔ جولائی ۱۷۹۰ء میں نواب آصفجاہ، پنڈت پردہان پیشوا اور کمپنی بہادر کے

درمیان دفاعی و ہجومی اتحاد کا معاہدہ ۲۰ ہوگیا اور اس کے بعد ہی تینوں قوتوں نے میسور پر حملہ کردیا۔

اس جنگ میں نظام الملک کی اعانت کے لئے کمپنی نے وہ فوج بھیجی جو خود نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی لیکن یہ فوج اس قدر ناقص و ناکارہ تھی کہ اس سے جنگ میں کوئی کام نہ لیا جا سکتا تھا۔ خود رزیڈنٹ (کیپٹن کنوے) نے اعتراف کیا کہ وہ نہایت غیر فوجی اور غیر مکمل حالت میں تھی۔ نظام نے جب اس کی سختی کے ساتھ شکایت کی تو لارڈ کارنوالس نے معذرت نامہ لکھا جس میں اُس نے صاف طور پر تسلیم کیا کہ

"ہز ہائینس کمپنی سے اس امر کی شکایت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ سرکار کمپنی ان کی ایسی اعانت کرنے سے قاصر رہے جس کے وہ معاہدہ اور پیہم مواعید کی رو سے مستحق تھے"[1]

بہرحال نظام نے وفائے عہد کا حق ادا کیا اور جنگ میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپو کو شکست ہوئی اُسے آدھا ملک اتحادیوں کے سپرد کرنا پڑا اور اس مفتوحہ علاقہ میں سے نظام کے حصہ میں ۱۳۱۶۶۶۶ ھن کا ملک آیا۔

انگریزوں کی بیوفائی اور فرانسیسی اثر کا دوبارہ عروج

جنگ میسور کے خاتمہ کے بعد ہی دولت آصفیہ کے ایک باتحت رئیس

---

[1] Memoirs and correspondence of Frazer p. 470.

جاگیردار کرنول کی تابعیت کے مسئلہ میں نظام اور ٹیپو سلطان کے درمیان نزاع برپا ہوئی جسے طے کرنے کے لئے نظام نے اس فوج کو طلب کیا جو خود انہیں کے روپیہ سے رکھی گئی تھی لیکن کمپنی نے اس کے دینے میں انتہا درجہ کی ٹال مٹول کی اور محض فوجی خدمت سے بچنے کے لئے یہاں تک کیا کہ کرنول پر نظام کے قانونی حقوق تک تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[۱]

اس کے بعد نظام کو ایک ایسے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کی ضرورت پیش آئی جو معاہدۂ سرنگا پٹن کی رو سے ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس کام کے لئے انہوں نے پھر کمپنی سے اپنی فوج طلب کی مگر پھر اسے بھیجنے سے انکار کر دیا گیا۔

۱۷۹۴ء میں کرنول کے نئے رئیس الف خاں نے کھلم کھلا نظام کی اطاعت سے انحراف کر کے ٹیپو سلطان کی اطاعت اختیار کر لی نظام نے چاہا کہ کمپنی کی فوج بھیجکر اسے راہ راست پر لائیں مگر اس مرتبہ بھی فوج دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ سرجان شور (گورنر جنرل) نے صاف الفاظ میں لکھدیا کہ:۔

"رزیڈنٹ کو نظام پر یہ امر واضح کر دینے کے ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے کہ کمپنی کی فوج کے ان کی خدمت میں حاضر رہنے کو ہماری باہمی دوستی کی ایک علامت سمجھنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے نظام کی سرکش رعایا سے خراج وصول کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے"[۲]

---

[۱] Our Faithfully Ally the Nizam p. 55.

[۲] ایضاً صفحہ ۶۳ - ۶۴

ان اہم واقعات سے نظام پر اچھی طرح روشن ہوگیا کہ کمپنی کی فوج انکے کسی کام کی نہیں ہے بلکہ کمپنی نے ان کے خرچ پر اپنی خدمت کے لئے رکھا ہے اسی زمانہ میں مرہٹوں سے نظام کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے مرہٹوں کی جانب سے چوتھ کے بقایا کا مطالبہ سخت تھا۔ اور نظام کو ہر وقت مرہٹہ فوج کے حملہ کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ نظام نے کمپنی کے رویہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی طرح بھی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور اپنے وفادار حلیف کے لئے حد سے حد یہی کر سکتی ہے کہ مصالحت کی کوشش کرے۔ دوسری طرف جب مرہٹوں کی طاقت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک فرانسیسی افسر موسیو ڈ بوئینے (M. Debogi Ne.) کی قیادت میں ایک زبردست باضابطہ فوج قائم کر لی ہے اور ان حالات کو دیکھکر نظام نے قطعی فیصلہ کیا کہ کمپنی کی ناکارہ فوج سے اپنا پیچھا چھڑائیں اور اپنی ایک مستقل باضابطہ فوج مرتب کریں چنانچہ اس غرض کے لئے ایک فرنچ افسر موسیو ریموں (M. Raymond) کو جو موسی رحمو کے نام سے مشہور ہے ملازم رکھا گیا اور اس کے ماتحت دیسی اور یوروپین فوجوں کے دستے مرتب کئے گئے اس کے علاوہ چند اور امریکن فرنچ اور انگریز افسروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔

ان افواج کی ترتیب کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں سے جنگ چھڑ گئی۔ مقام کھرڈلہ پر سخت معرکہ ہوا جس میں نظام کو شکست ہوئی اور انہیں اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ ۳۶ لاکھ کا ملک اور ۳ کروڑ روپیہ نقد مرہٹوں کو دینگے اور ارسطو جاہ کو یرغمال کے طور پر انکے سپرد کر دیں گے جس کا نتیجہ تھا کہ

نظام نے کمپنی کی دوستی پر بھروسہ کیا اور پہلے ہی خود اپنی فوجی قوت کو مضبوط
کرنے کی کوشش نہ کی۔

جنگ کھڑلہ سے واپس ہوتے ہی نظام نے انگریزی پلٹنوں کی برطرفی کا
حکم دیدیا اور موسی رحمو کی جمعیت کو ترقی دینی شروع کی یہاں تک کہ وہ ۱۵
ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی اور اس کیلئے ۱۳۰۰۰۰ روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا۔ اس کے سوا
حیدرآباد میں ایک جنگی کارخانہ بھی قائم کیا گیا جس میں ہر قسم کا بہترین سامان جنگ
تیار ہوتا تھا۔ ان واقعات سے بہت ممکن تھا کہ حالات ایک نیا رخ بدل لیتے اور
تاریخ کوئی دوسری شکل اختیار کرتی لیکن اس زمانہ میں ایک زبردست سازش کھڑی
ہوگئی۔ شاہزادہ عالیجاہ کو باپ کے خلاف بغاوت پر ابھارا گیا۔ بیدر کے زمیندار
اس کے ساتھ مل گئے۔ مرہٹوں کی امداد بھی اسکو حاصل ہوگئی۔ اور نظام کا تخت
خود ان کے اپنے جگر گوشہ کے ہاتھوں خطرہ میں پڑھ گیا۔ ایسی حالت میں نظام
دوبارہ کمپنی سے امداد طلب کرنے پر مجبور ہوگئے اور وہی فوجیں جنکی برطرفی کا
حکم دیا جا چکا تھا مجبوراً پھر مانگ لی گئیں۔ تاہم ابھی تک فرانسیسی اثر پورے
زور پر تھا۔ ولی عہد سلطنت نواب سکندر جاہ کی موسی رحمو سے بیحد موافقت تھی
یہاں تک کہ وہ رحمو کے سر کی قسم کھایا کرتے تھے۔ دربار میں اس کے اثر کا
یہ عالم تھا کہ ہر پارٹی اس کی تائید حاصل کرنے کی خواہشمند تھی اور اسکی
مخالفت کی کسی کو جرات نہ ہوتی تھی باوجودیکہ دربار کے بڑے بڑے امراء
شاہزادہ فریدوں جاہ کو ولی عہد بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر چونکہ
رحمو شاہزادہ سکندر جاہ کا مؤید تھا اس لئے سب دم بخود تھے۔ ۱۷۹۶ء

میں جب نواب غفران مآب سخت بیمار تھے تو ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ

بلاشک و شبہ یہ فرانسیسی اس وقت ایسی پوزیشن میں ہے کہ نظام کا انتقال ہو جانے کی صورت میں وہ جس کو چاہے گا مسند نشیں کرا دے گا۔[1]

اس زمانہ میں ٹیپو سلطان نے نواب آصف جاہ کو انگریزوں کے خلاف ایک جہاد عام میں شرکت کی دعوت دی اور ایک طویل خط لکھا جس میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیکر نواب کو اس فریضۂ دینی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مل کر ان ممالک کو کفار سے واپس لیں جو پہلے دارالاسلام رہ چکے ہیں۔ ایک طرف ان باتوں کا اور دوسری طرف انگریزوں کی سابق بیوفائیوں کا نظام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے انگریزی رزیڈنٹ کیپٹن کرک پٹرک کو حکم دیدیا کہ وہ کمپنی کی فوجوں کو واپس بھیجدے قریب تھا کہ انگریزی کمپنی سے نظام کے تعلقات منقطع ہو جاتے۔ مگر عین وقت پر سیاسی فریب کاری نے کمپنی بہادر کی دستگیری کی۔ رزیڈنٹ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ نظام اور ٹیپو سلطان کے مابین کرنول کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔[2] میر عالم نے اس کام میں رزیڈنٹ کی امداد کی اور بڑے وثوق کے ساتھ نظام کو یقین دلایا کہ ٹیپو نے کرنول پر قبضہ

---

[1] Our Faithfull Ally p. 459.

[2] ایضاً صفحہ ۲۱۲—۲۱۳

کر لینے کا پورا سامان کر لیا ہے۔ انگریزوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں ارسطو جاہ بھی پونا سے چھوٹ کر آگئے اور انہوں نے بھی اپنی قوت اسی جماعت کی تائید میں شامل کر دی جو ٹیپو سلطان کے ساتھ نظام کے اتحاد کی مخالف تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ٹیپو کے وکلاء ناکام و نامراد واپس ہو گئے اور انگریزی فوجوں کی واپسی کا حکم واپس لے لیا گیا۔

انگریزوں سے ازسرِ نو اتحاد

اس موقع پر قدرت نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مارچ ۱۷۹۸ء میں موسیٰ ریمو مر گیا اور اس کی جگہ ایم پیروں (Meperran) مقرر ہوا جو اپنے پیشرو کی سی قابلیتیں نہ رکھتا تھا۔ ان واقعات نے دفعۃً حالات کے رخ کو بدل دیا اور ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔ نظام کی مرہٹوں سے پہلے ہی دشمنی تھی اب انگریزوں کی چالاکی سے ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ٹھن گئی۔ اتنے دشمنوں میں تنہا اپنی سلطنت کا وجود قائم رکھنا ان کیلئے مشکل تھا اس لئے انہوں نے دوبارہ انہی بیوفا دوستوں کی طرف رجوع کیا جو محض اپنے فائدہ کے لئے دوستی کرنے کے عادی تھے۔ انگریز ٹیپو کا سر کچلنے اور اس کے بعد مرہٹوں کا استیصال کرنے کے لئے اس کے دل سے آرزومند تھے۔ دکن میں انکی ساری سیاست کا محور یہی ایک نقطہ تھا کہ نظام سب طرف سے کٹ کر صرف ہماری ہی دوستی پر بھروسہ کرنے لگیں جیسا کہ

لارڈ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول کو لکھا تھا کہ اس زمانہ میں انگریزی قوم کیلئے بہترین پالیسی یہی تھی کہ نظام کے وزن کو ہندوستانی طاقتوں کے پلڑے میں شامل ہونے سے روک دیں چنانچہ ٹیپو کی طرف سے نواب کے انحراف طبع کو دیکھتے ہی انگریزوں نے دوستانہ اتحاد کی درخواست پھر پیش کی اور ستمبر ۱۷۹۸ء میں ایک جدید عہد نامہ رقم پذیر ہوا جس کی رو سے انگریزوں کی جمعیت تعلبندی (Subsidiary Force.) کو مستقل کر دیا گیا۔ اسکی تعداد بڑھا کر چھ پلٹنوں تک کر دی گئی۔ اس کے لئے سرکار نظام کے خزانہ پر ۲۴۱۷۱۰۰ روپیہ سالانہ کا بار ڈالا گیا اور اس کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ نظام کی ذات اور انکی سلطنت کی حفاظت کرے اور ریاست کے باغی سرداروں کی سرکوبی کرے۔ مگر یہ شرط لگا دی گئی کہ چھوٹے چھوٹے کام اس سے نہ لئے جائیں گے اور نہ مالگذاری وصول کرنے کے لئے سبندی کا کام اس سے لیا جائے گا۔ اور نہ کمپنی کے دوستوں کے خلاف اس کو استعمال کیا جائے گا۔ اس کے عوض حکومت نظام نے وعدہ کیا کہ اس فوج کے پہنچتے ہی فرانسیسی فوجوں کو منتشر کر دیگی اور آئندہ کسی فرانسیسی کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھے گی۔ اور نہ کسی یوروپین کی خدمات کمپنی کی ضمانت کے بغیر حاصل نہ کرے گی۔

اس عہد نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ہی کمپنی کی فوجیں حیدرآباد پہنچ گئیں فرانسیسی افسروں کے ماتحت نظام کی باقاعدہ فوج کو زبردستی منتشر کیا گیا۔ اور جتنے فرانسیسی سرکار نظام کے ملازم تھے ان کو گرفتار کر کے یورپ

بھیجدیا گیا[۱۵]

ٹیپو سلطان کا استیصال

۱۷۹۸ء کا یہ معاہدہ انگریزی ڈپلومیسی کی عظیم الشان فتح تھا۔ ٹیپو سلطان
نے انگریزوں سے آخری اور فیصلہ کن مقابلے کے لئے جو زبردست تیاریاں کی تھیں انہیں
اگر نظام الملک کی طاقت اسکے ساتھ شامل ہو جاتی تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا لیکن
انگریزوں نے ایکطرف ان دونوں اسلامی فرمانرواؤں میں پھوٹ ڈالی دوسری ۱۵ ہزار کی
زبردست فوج کو جو سلطنت آصفیہ کی جنگی طاقت کا سب سے بڑا سہارا تھی ایک قطرہ خون
بہائے بغیر منتشر کر دیا اور تیسری طرف مملکت آصفیہ کے وسیع ذرائع ثروت و قوت کو اپنی
تائید میں حاصل کر لیا جس سے جنوبی ہند میں ان کو فیصلہ کن قوت حاصل ہو گئی اور جنکی
بدولت وہ مرہٹہ اور ٹیپو کی طاقتوں کو فنا کر کے مدراس سے وندھیاچل کے مالک و مختار
بن گئے یہ نتائج تنہا انگریزوں کی چالاکی ہی سے حاصل نہیں ہوئے بلکہ ہندوستانیوں کی
اپنی کمزوریوں نے بھی انہیں برابر کا حصہ لیا اسوقت دکن میں تین زبردست طاقتیں
تھیں ایک مرہٹے اور دوسرے نظام تیسرے میسور اگر ان تینوں طاقتوں میں حسن تفاہم و اتحاد
ہوتا تو انگریزوں کے پاؤں جمنے مشکل تھے لیکن بدقسمتی سے ان تینوں میں باہم سخت
رقابت تھی۔ مرہٹے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ٹیپو سلطان اپنے
مجاہدانہ خلوص کے باوجود ملک گیری کی خواہش سے خالی نہ تھا۔ اور نظام الملک
اپنے گرد و پیش کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ان دونوں ہمسایوں پر اعتماد نہ کر سکتے تھے
اس سوء تفاہم اور بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو دکن کی بساط پر خود دکن کے

---

[۱۵] Our Faithfull Ally The Nizam p. 219-20.

پھر سے لڑائی کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ پہلے نظام اور مرہٹوں کو ملا کر انہوں نے ٹیپو کا استیصال
کیا پھر نظام کی مدد سے مرہٹوں کا زور توڑا اور اس کے بعد ارادہ تھا کہ نظام کی سلطنت کو
بھی ہضم کر جائیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا مگر خدا کو اس ملت اسلامیہ کا بقا مقصود تھا
اس لئے ساری بلا صرف برار پر ٹل گئی اور اسلام کی عظمت رفتہ کا نشان اس ملک میں محفوظ رہ گیا۔

واقعات کے سلسلہ کو جوڑتے ہوئے اب ہم اس ماتہ پر پہنچتے ہیں جبکہ انگریزوں نے
اپنی تدبیروں کا جال مکمل کرنے کے بعد اطمینان کے ساتھ ٹیپو سلطان کا خاتمہ کر دیا۔ نواب
آصفجاہ سے معاہدہ ہونیکے بعد ہی ۱۷۹۹ء میں میسور سے جنگ چھڑ گئی ٹیپو سلطان اپنی تمام
تدبیروں میں ناکام ہو چکا تھا تنہا اپنی فوجی قوت سے مقابلہ نہ کر سکا اور آخر اپنے منصوبوں
کی تکمیل میں جان لڑاتے ہوئے شہید ہو گیا اس کے بعد از روئے انصاف ملک کو نظام اور
کمپنی کے درمیان مساویانہ تقسیم ہونا چاہئے تھا مگر لارڈ ولزلی نے نظام کو صرف
۶۰۵۳۳۲ ہن کا ملک دیا اور میسور کی ریاست راجگان میسور کے قدیم خاندان کے
سپرد کر دی اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ میسور کو تقسیم کرنے کی صورت میں لارڈ ولزلی کو اندیشہ
تھا کہ نظام کے ہاتھ ایسے مضبوط قلعے آجائیں گے جن سے برطانی سرحد ہمیشہ خطرے میں رہیگی

۱۸۰۰ء کا معاہدہ

اس خرخشے سے نجات پانیکے بعد کمپنی کی سیاست کا رخ مرہٹوں کی طرف پھر گیا
اور اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے دوسری طرف نظام کی
سلطنت میں میسور کی دو لڑائیوں سے جو افزائش ہو گئی تھی اس کا تدارک بھی ضروری تھا
تیسری طرف انگریزی سلطنت کے مزید استحکام کیلئے اس امر کی ضرورت محسوس کیجا رہی تھی کہ
ہندوستانی ریاستوں میں باہم کسی قسم کے تعلقات باقی نہ رہیں کیونکہ انکے آپس کے تعلقات

یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کبھی باہم متحد ہو کر کمپنی کی توسیع مملکت میں مزاحم ہوں۔ ان اغراض سہ گانہ کو پیش نظر رکھ کر لارڈ ولزلی نے نظام سے ایک نئے معاہدہ کیلئے گفت و شنید شروع کی اور آخر ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ایک عہدنامہ مرتب ہوا جس نے انگریزی حکومت کے ساتھ نظام کے تعلقات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کیا اس عہدنامہ کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) دونوں سلطنتوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے گی تو دونوں ملکر ان کا مقابلہ کرینگی۔ نیز برٹش گورنمنٹ نے عہد کیا کہ وہ کسی طاقت کو نظام کے ممالک محروسہ پر حملہ نہ کرنے دیگی اور خود اپنے مقبوضات کی طرح نظام کے مقبوضات کی بھی حفاظت کریگی (جنگ کھڑلہ کے موقع پر نظام اسی قسم کے اتحاد کے خواہشمند تھے مگر چونکہ اس وقت میسور کی مہم پیش نظر تھی اس لئے مرہٹوں کو خوش رکھنے کے لئے ایسا اتحاد کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

(۲) اس مدافعت کے کام میں کمپنی کی مدد کرنے کیلئے طے ہوا کہ جمعیت نعلبندی (Subsidiary Force) میں مستقل طور پر دو پلٹنوں کا اضافہ کر دیا جائے (یعنے کل ۸ ہزار فوج رکھی جائے)

(۳) اس فوج کے مصارف ادا کرنے کیلئے نظام نے وہ تمام ملک کمپنی کے سپرد کیا جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی جنگہائے میسور میں ان کے ہاتھ آیا تھا اور جسکی سالانہ آمدنی ۶۳ لاکھ روپیہ تھی۔

(۴) کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں نظام نے وعدہ کیا کہ جمعیت نعلبندی کی ۶ پلٹنوں کے علاوہ وہ خود اپنی فوج میں سے ۱۵ ہزار سپاہی مع ساز و سامان گورنمنٹ کی مدد کے لئے بھیجیں گے۔

(۵) نظام نے عہد کیا کہ وہ کمپنی کی اطلاع کے بغیر کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کے تعلقات نہ رکھیں گے۔ اس کے عوض کمپنی نے عہد کیا کہ وہ نظام کی اولاد انکے اعزہ اور انکی رعایا اور ان کے ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی جن کے حق میں نظام کے اختیارات مطلق ہوں گے۔

(۶) دوسری طاقتوں سے حکومت نظام کی نزع ہونے کی صورت میں کمپنی کی حکومت کو فیصلہ کرنے کا کامل اختیار ہوگا۔

(۷) کمپنی نے وعدہ کیا کہ اگر شوراپور اور گدوال کے زمیندار یا نظام کے دوسرے ماتحت سرداران کے جائز حقوق ادا کرنے سے احتراز کریں گے یا ان کے ممالک محروسہ میں غدر و فتنہ برپا کریں گے۔ تو جرم کی حقیقت کو اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد جمعیت تعلبندی انکو نگونسار کرنے کیلئے ہزہائینس کی افواج کے ساتھ شرکت عملی کریگی۔ [1]

اس معاہدہ کی اکثر شرائط ایسی تھیں جن کو انگریزی حکومت نظام سے تسلیم کرانے کے لئے عرصہ سے بے چین ہو رہی تھی خصوصاً پانچویں اور چھٹی شرط کی انہیں خاص ضرورت تھی تاکہ نظام برٹش سلطنت کی حمایت (Protection) قبول کرکے اپنی خارجی آزادی سے دست بردار ہو جائیں۔ نومبر ۱۷۹۹ء میں جب نواب غفران مآب میر نظام علیخاں بستر بیمار تھے اور زندگی کا بھروسہ نہ رہا تھا تو نواب سکندر جاہ کے سامنے بھی شرائط پیش کی گئی تھیں اور ان سے صاف کہہ دیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ انکی مسند نشینی کی تائید صرف اسی صورت میں کر سکتی ہے کہ وہ ان شرائط کو قبول کر لیں۔ [2]

---

[1] Aitchisons Treates and Engagements Vol. IX. p. p. 67-73.

[2] Wellington's Despatches May, 19-1803.

میر نظام علی خاں کا انتقال اور مصائب کا آغاز

اگست ۱۸۰۳ء میں نواب میر نظام علیخاں کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نواب سکندر جاہ بہادر مسند نشین ہوئے۔ غفراں مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی انگریزوں نے مدار المہام سلطنت ارسطو جاہ سے ساز باز کر کے نواب سکندر جاہ کو بے بس کر دیا تھا مگر سال بھر بعد جب ارسطو جاہ مر گئے تو انگریزوں کو قدم جمانے کا پورا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے اپنے پرانے دوست میر عالم کو جنہوں نے دکن میں انگریزی ترقی کے لئے سب سے زیادہ کوشش کی تھی اور جن کو لارڈ کارنوالس نے نواب غفراں مآب کی زندگی میں وزارت امور خارجہ کا عہدہ نسلاً بعد نسل دلوانے کا ارادہ کر لیا تھا۔[۱] مدار المہامی پر مامور کرا دیا گو انگریزی حکومت کو مدار المہام کے انتخاب اور تقرر کے مسئلہ میں بلکہ سرکار نظام کے کسی داخلی مسئلہ میں بھی مداخلت کا کوئی حق نہ تھا لیکن اگر ناجائز فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ملتا ہو تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا انگریزی ڈپلومیسی میں گناہ ہے اس لئے انگریزی سلطنت نے معاہدانہ پابندیوں کو بالائے طاق رکھکر سرکار آصفیہ کے اس خالص اندرونی مسئلہ میں پہلی مرتبہ مداخلت کی ابتداء کی اور میر عالم بہادر کے حق میں اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ مسٹر گنش رزیڈنٹ مسٹر رسل لکھتا ہے کہ :-

۱۸۰۴ء میں اعظم الامراء کے انتقال کے بعد ہم نے نظام پر میر عالم کو مسلط کر دیا۔

---

[۱] - تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۸۳

لیکن اسی ریسل نے اپنے ۲۴ نومبر ۱۸۱۹ء کے ایک مراسلہ میں میر عالم کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔

"بلا شک وہ پبلک معاملات میں بڑی قابلیتوں کا مالک تھا مگر دل کی ان خوبیوں سے قطعاً عاری تھا جو اعلیٰ دماغی قوتوں کی کمی کو پورا کرتی ہیں وہ حریص بخیل کینہ پرور اور سنگدل تھا اس نے نہ کسی احسان کو یاد رکھا اور نہ کسی قصور کو بھلایا اگرچہ وہ سخاوت کے اظہار کا شوقین اور ہر دلعزیزی کا طلبگار رہتا مگر اس کے دل میں اپنے ابنائے نوع کے لئے نہ منفرداً نہ مجتمعاً کوئی جذبۂ ہمدردی تھا۔ اس کے احوال اور اس کی قابلیتوں نے اسکو اپنی حکومت کیلئے عمدہ کام کرنے کی اتنی قدرت بہم پہونچائی تھی جتنی اس حکومت کے کسی لازم کو کبھی حاصل نہیں ہوئی مگر اس نے بہت سی خرابیوں کو بڑھا دیا اور کسی ایک کو بھی کم نہ کیا، اس کا دورِ حکومت زیادہ تر نظام سے اقتدار چھیننے میں گذر گیا۔"[۵]

یہ اس دیوان کی خصوصیات تھیں جس کو انگریزی حکومت اپنی اغراض کیلئے حیدرآباد کے منصب وزارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتی تھی۔ مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے معاملات صرف یہیں تک نہیں رہے بلکہ انہیں اپنا اثر بڑھانے کے لئے اس کے بعد بہم مواقع ملتے چلے گئے ۱۸۰۶ء میں میر عالم نے مہاراجہ چندو لال کو اپنا پیشکار بنایا ۱۸۰۸ء میں میر عالم کا بھی انتقال ہو گیا اور منصب وزارت کے لئے دو امیدوار آگے بڑھے ایک شمس الامراء امیر کبیر دوسرے منیر الملک جو میر عالم کے داماد تھے۔ لارڈ منٹو نے شمس الامراء کی

۵؎ Hyderabad Affairs Vol. 11-p. 84.

سفارش کی[1] مگر منیر الملک نے مہاراجہ چندو لال سے بحلف شرعی عہد کیا کہ اگر انہیں دیوانی مل جائے تو وہ تمام اختیارات مہاراجہ کے سپرد کردیں گے اور خود کسی معاملہ سے سروکار نہ رکھیں گے[2]۔ خود انگریزی سلطنت نے بھی منیر الملک کے تقرر کو اس شرط کے ساتھ منظور کر لیا کہ وہ تمام اختیارات مہاراجہ چندو لال کو دیدیں۔ چنانچہ اسی کے موافق عمل درآمد ہوا۔ اور مہاراجہ کو سیاہ و سپید کے اختیارات مل گئے جنہیں وہ ۱۸۴۳ء تک پوری مطلق العنانی کے ساتھ استعمال کرتے رہے۔

اس زمانہ سے ریاست کے مصائب کا ایک ایسا المناک دور قائم انگیز دور شروع ہوا جس سے اس کا زندہ اور سلامت بچکر نکل آنا معجزہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں اس دور مصائب کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ اس دور کی تین نمایاں خصوصیات تھیں ایک یہ کہ ریاست کی اندرونی معاملات میں انگریزی حکومت کو مداخلت کا پورا موقع دیا گیا اور انگریزی رزیڈنٹ کی خواہشات پر ریاست کے مفاد کو قربان کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ریاست کے انتظام کو نااہل لوگوں پر چھوڑ دیا گیا اور ذمہ دار عہدوں کے لئے اہلیت کا معیار قابلیت کو نہیں بلکہ نذرانوں اور شخصی تعلقات کو قرار دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ مداخل و مخارج کا توازن باقی نہ رہا اور قرض لیکر خسارہ کو پورا کرنا ریاست کی مالی پالیسی کا ایک مستقل جزو بن گیا حیدرآباد میں ایک انگریز ولیم پامر نے

---

[1] اس وقت شمس الامراء حیدرآباد کے اکابر میں سب سے زیادہ یوروپین تہذیب کی طرف مائل تھے اسی لئے گورنر جنرل کی نظر ان پر پڑی لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انگریزی اغراض کے لئے منیر الملک سب سے زیادہ مفید تھے [2] تاریخ رشید الدین خانی ص ۱۹۵

ساہوکارہ کی دوکان کھول رکھی تھی جس سے رزیڈنسی کا گہرا تعلق تھا اس سے ۲۴ فیصدی تک کی بھاری شرح سود پر رقمیں لی جاتیں اور نہیں ریادلی کیساتھ خرچ کیا جاتا تھا۔ اسطرح ۱۸۲۳ء تک ریاست ایک کروڑ ۱۶ لاکھ روپئے کی قرضدار ہوگئی جسے بھگتانے کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ شمالی سرکار کا پیشکش ۷ لاکھ روپیہ سالانہ انگریزی حکومت کو ہمیشہ کے لئے معاف کیا گیا اور اس کے عوض یہ قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا اس کے بعد دوسرے مہاجنوں سے رقمیں قرض لیجاتی رہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے نواب سکندرجاہ نے اپنی زندگی میں ریاست کو ایک کروڑ روپیہ دیا اور ان کے بعد نواب ناصرالدولہ نے ۸۰ لاکھ روپیہ اپنے پاس سے دیا۔[15] لیکن اس کے باوجود ریاست کی قرضداری کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۳ء میں مہاراجہ چندولال نے استعفاء دیا تو جنرل فریزر کے بیان کے مطابق تمام قرضوں کو ادا کرنے کے لئے ریاست کو دو کروڑ روپیہ کی ضرورت تھی اس کے علاوہ بہت سے ایسے ناجائز مصارف کا بار ریاست کے خزانہ پر پڑا ہوا تھا۔ جنکی بدولت آخر ملک کا ایک قیمتی حصہ ریاست کو دینا پڑا۔

سیاسی مرتبہ میں کمی

اس بدانتظامی اور کمزوری کا راست نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے سیاسی مرتبہ کو سخت نقصان پہنچا۔ انگریزی حکومت کا اصول تو یہ ہے کہ "دلا قوی کے ساتھ سپک سری اور کمزور کے سامنے سرگرانی" جب تک نواب غفران مآب

[15] - رشید الدین خانی صفحہ ۱۵۰ و ۳۶۷

میر نظام علیخاں کے عہد میں ریاست کی بنیاد مضبوط تھی، انگریزی حکومت
انکی شاہانہ خود مختاری کا پورا احترام ملحوظ رکھتی تھی اور ان کے اندرونی معاملات
میں دخل دینے سے کامل اجتناب کرتی تھی۔ سفارتی تعلقات میں دونوں سلطنتوں
کے درمیان کامل مساوات تھی بلکہ ایک باجگذار حکومت ہونے کی حیثیت سے
انگریزی حکومت کے لئے ایسے آداب مقرر تھے جو کمتر درجہ کے حلیف کے لئے
موزوں ہوتے ہیں لیکن نواب غفراں مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی جب
ریاست کو گھن لگنا شروع ہوا اور اس کی اندرونی طاقت مضمحل ہونے لگی
تو انگریزی حکومت کا رویہ بھی بدلنے لگا۔

غفراں مآب کے عہد تک دونوں سلطنتوں میں برابر کے سفارتی تعلقات
تھے حیدرآباد میں رزیڈنٹ اور کلکتہ میں ایلچی رہتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد
۱۸۰۵ء میں جب میرزا عبد اللطیف کی جگہ یاور الدولہ کو ایلچی بنا کر بھیجا گیا تو
گورنر جنرل نے ان کو ناپسند کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ واپس بھیج دیئے
گئے۔ ان کے بعد پھر سفارت موقوف ہوئی اور حیدرآباد کے رزیڈنٹ کی ذات
دونوں عہدے جمع ہوگئے۔

غفراں مآب کے عہد تک رزیڈنٹ کو ریاست کے اندرونی معاملات
میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر ان کے بعد نواب سکندر جاہ کے عہد
میں پہلے دیوان و پیشکار کے تقرر کے مسئلے میں رزیڈنٹ نے مداخلت کی
پھر رفتہ رفتہ ملک کے انتظامی معاملات میں اس کا دخل بڑھتا رہا یہاں تک کہ
مالگذاری کے بندوبست اور عہدہ داروں کے تقرر تک رزیڈنٹ کا حکم

بالاتر رہنے لگا اور بادشاہ کے خلاف خود اس کے ملازموں کی پشتیبانی کرنا انگریزی حکومت کی پالیسی کا مستقل جزو بن گیا۔ حد یہ ہے کہ نظام سے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ :۔

"مہاراجہ چندولال کی علیحدگی سے دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا...... اگر ہز ہائینس کے معاملات کا انصرام کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر برٹش گورنمنٹ بھروسہ نہ کرسکتی ہو تو ممکن ہے برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ ناگزیر ہو جائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگہبانی کسی دوسرے ڈھنگ سے کرے بجائے اس طریقہ کے جو اب تک کافی پایا گیا ہے"[۵۱]

اس سے ریاست میں جو ابتری پھیلی اس کا بیان خود انگریزی رزیڈنٹ کرنل اسٹوارٹ (..............) کی زبان سے سننا چاہئے جو اس نے ۱۸۳۴ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا :۔

"جو لوگ اس دربار میں ۳۰ سال سے ہماری پالیسی کو دیکھ رہے ہیں انہوں نے دیکھا ہے کہ ہم کس طرح خود اپنے بنائے ہوئے آدمیوں کو وزارت دلواتے ہیں اور خود ان کے بادشاہ کے خلاف انکی حمایت کرتے ہیں کس طرح ہم نے سرکار آمد فوج پر قابو حاصل کرلیا ہے اور کس طرح ہم ملک کے دیوانی انتظام پر حاوی ہو گئے ہیں وہ اس حقیقت میں مشکل سے کوئی شک کرسکتے ہیں اور سب سے کم خود نظام کو اسمیں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس ملک کا واقعی حکمران سمجھ لیا ہے۔ بہت سی خرابیاں جو ریاست میں موجود ہیں

---

۵۱ Memoirs of Fraser p 358.

بلاریب ہماری بے ضابطہ مداخلت کے ناگزیر نتائج ہیں اس لئے بات مشکل ہی سے درست ہو سکتی ہے کہ نظام اور ان کے دیوان کو جس حال میں وہ آج کل ہیں، ان خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جائے میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان کو درست کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ درحقیقت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم خود ان خرابیوں کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں کیونکہ انہیں دفع کرنے کی قدرت ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

اس قسم کا اعتراف سر چارلس مٹکاف نے بھی کیا ہے جو برطانیہ کی سرکاری کتاب (بلیو بک) میں شایع ہو چکا ہے [۱]

نواب سکندر جاہ کے زمانہ تک ظاہری ادب و آداب بدستور باقی تھے۔ گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری مراسلات میں "نیاز مند" لکھتا تھا اور نظام اپنے لئے "مابدولت" کا لفظ استعمال کرتے تھے ۱۸۲۹ء میں جب ان کا انتقال ہوا اور نواب ناصر الدولہ انکی جگہ مسند نشین ہوئے تو ان کے ساتھ مساویانہ خطو کتابت شروع ہو گئی۔ میر عالم کے زمانہ میں دیوان ریاست سے گورنر جنرل کی خط و کتابت برابر کے دوستوں کی سی ہوتی تھی مگر ۱۸۴۷ء میں جب سراج الملک نے دیوانی کے عہدہ پر سرفراز ہو کر انہی آداب و القاب کو استعمال کیا تو گورنمنٹ کی طرف سے صاف لکھدیا گیا کہ :۔

ہندوستان کے حالات اب اس وقت بہت بدل چکے ہیں جبکہ ان کے پیش رو میر عالم کو یہ القاب ۴۰ برس پیشتر لکھے گئے تھے جنہیں اب مثال کے طور پر پیش کیا

---

[۱] Memoirs p. 86.

جاتا ہے ہندوستان کے گورنر جنرل اور حیدرآباد کے دیوان کی اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ برٹش گورنمنٹ کے نمائندے کو اس طریقے سے خطاب کیا جائے جو ایک زیر حمایت اور امداد پانے والی ریاست کے وزیر کے ساتھ مساوات کو پہنچتا ہو۔[۱]

اس کے بعد رفتہ رفتہ ریذیڈنٹ نے بھی اور آداب کو رخصت کرنا شروع کیا۔ نواب ناصرالدولہ کے ابتدائی زمانہ میں جنرل فریزر شکایت کرتا ہے کہ یہاں کے آداب بہت تکلیف دہ ہیں۔[۲] مگر انہی کے آخری زمانہ میں جب کرنل لو ریذیڈنٹ ہو کر جاتا ہے تو وہ دربار میں نہایت گستاخانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ صاحب تاریخ رشید الدین خانی لکھتا ہے کہ:۔

"چونکہ جان لو صاحب نے دربار گذشتہ و حال میں مثل سفیران سابق کے لحاظ اور آداب حضور کا نشست و برخاست اور کلام میں نہ کیا اکثر گستاخانہ اور بیباکانہ کلمات سے پیش آئے اس سے خود بدولت اپنے نزدیک چند سے بہت آزردہ خاطر رہے اور خیلے دل پر ملال گذرا (صفحہ ۳۸ و ۳۹)

نواب افضل الدولہ بہادر کے زمانہ تک بھی بہت کچھ پرانے نیازمندانہ آداب کی پابندی باقی تھی لیکن نواب میر محبوب علیخاں مرحوم کی کم سنی کے زمانہ سے

---

[۱] Memoirs. p. 217.

[۲] فریزر لکھتا ہے کہ نظام سے ملاقات بہت رسم اور تکلفات کی ہوتی ہے اور ریذیڈنٹ سے ایسے مواقع پر جن آداب کی پابندی کرائی جاتی ہے وہ اس زمانہ سے چلے آرہے ہیں جب کہ ہمارے ابتدائی تعلقات کے زمانہ سے ریذیڈنٹ کی کچھ ایسی نوعیت ہے کہ میں انکو حکومت عالیہ و دیسی ریاستوں کی موجودہ اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے ریذیڈنٹ کی نمائندہ پوزیشن کے مناسب حال نہیں سمجھتا (میموئرز آف فریزر صفحہ ۱۹۳)

ان میں کمی شروع ہوئی یہاں تک کہ اب رزیڈنٹ ان تمام درباری آداب سے مستثنیٰ ہو چکا ہے جو ریاست میں رائج ہیں۔

لیکن اس دور انحطاط میں سب سے زیادہ ریاست کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی اصلی المناک داستان کچھ دوسری ہے جس کو اختصار کے ساتھ آگے بیان کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کنٹجنٹ کا قیام

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۷ کے مطابق جمعیت تعلبندی کے فرائض یہ مقرر کئے گئے تھے کہ وہ ان لوگوں کی سرکوبی کرے گی جو سرکار نظام کے جائز مطالبات ادا کرنے سے گریز کریں گے۔ یا سرکار کے ممالک محروسہ میں بدامنی پھیلائیں گے لیکن اس معاہدہ کے گیارہ ہی مہینے بعد جب شوراپور کے زمیندار نے خراج دینے سے انکار کیا تو کمپنی نے فوج بھیجنے میں بہت حیلہ و حجت کی اور ۶ مہینہ بعد اسے بھیجا بھی تو ایسی شرائط پر جو خلاف معاہدہ تھیں اس کے بعد پہلی جنگ مرہٹہ پیش آئی جس میں نظام نے معاہدہ کے مطابق ایک زبردست فوج سے کمپنی کی مدد کی اور اس نے بہت مفید خدمات انجام دیں لیکن اس فوج میں بہت سے عیوب نکالے گئے اور کہا گیا کہ اس نے کچھ کام نہیں کیا۔[۱] ان چالوں کا مقصد یہ تھا کہ نظام کو ایک اور فوج خود اپنی کے خرچ پر رکھنے کی صلاح دی جائے چنانچہ سنہ ۱۸۰۴ء میں گورنر جنرل نے نظام سے اصرار کیا کہ وہ ایک نئی فوج کمپنی کے زیر انتظام قائم کریں جس کا کام سرکش زمینداروں و راجاؤں کی

---

[۱] تاریخ رشید الدین خانی صفحہ [illegible] و صفحہ [illegible]

سرکوبی کرنا ہو۔ یہ بالکل وہی خدمت تھی جس کو انجام دینے کے لئے ۶۳ لاکھ کا ملک ویکر نظام نے جمعیت تعلیبندی قائم کرائی تھی اس لئے انہوں نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کمپنی کی حکومت نے اس پر یہاں تک زور دیا کہ اتحاد کو منسوخ کرنے کی دھمکی دیدی اور نظام کو ڈرایا گیا کہ اگر اتحاد منسوخ ہو گیا تو آپکی ریاست کمپنی کے مقبوضات سے ملحق کر لیجائے گی[ھ۱] مگر جب دھمکیوں سے بھی کام نہ چلا تو ۱۸۱۳ء میں ہنری رسل رزیڈنٹ اور مہاراجہ چندولال پیشکار نے باہمی اتفاق سے دو ہزار سواروں کی ایک فوج قائم کر لی جس کا نام رسل بریگیڈ رکھا گیا[ھ۲]۔ بعد میں بڑھاتے بڑھاتے اسکو چہار چند کر دیا گیا اس کے اخراجات کے لئے تقریباً ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا بار ریاست کے خزانہ پر ڈالا گیا اور یہی فوج حیدرآباد کنٹنجنٹ بن گئی۔ اس فوج کے قیام کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ چونکہ جمعیت تعلیبندی کمپنی کے زیر اثر ہے اور ضرورت کے وقت اسکی خدمات فوراً حاصل نہیں کیجاسکتیں اسلئے ایک باضابطہ فوج خود ریاست کے زیر حکم رہنی چاہئے تاکہ اس سے فوراً کام لیا جا سکے۔ لیکن یہ محض ایک دھوکہ تھا در اصل یہ فوج بالکل رزیڈنٹ کے ماتحت تھی۔ ریاست کو اس پر مطلق اختیار نہ تھا۔ رزیڈنٹ ہی اس کا افسر اعلیٰ تھا اسی کو عزل و نصب اختیار تھا اسی کی اجازت پر اس کی نقل و حرکت منحصر تھی اور اس کے حکم کے بغیر کنٹنجنٹ کے ایک سپاہی سے بھی ریاست کی کوئی خدمت نہیں لیجا سکتی تھی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کنٹنجنٹ کا قیام نظام کی اجازت کے بغیر عمل میں

ھ۱ Wellingtons Despatches Jan. 19-1805.

ھ۲ ۔ تاریخ رشید الدین خانی صـ۱۳۱

آیا۔ اور نظام کی مرضی کے خلاف اس کو قائم رکھا گیا ہے ریکارڈ پر کافی ثبوت موجود ہے۔ لارڈ مٹکاف نے اپنی ۱۶ مارچ ۱۸۳۲ء کی یادداشت میں صاف لکھا ہے کہ

"کنٹنجنٹ فورس درحقیقت ہمارے اور راجہ چندو لال کے درمیان ایک مشترکہ کاروبار ہے"[1]

مسٹر فریڈرک کری جو لارڈ ڈلہوزی کی کونسل کا ایک رکن تھا ۲ مراپریل ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ

"کنٹنجنٹ دراصل مسٹر رسل رزیڈنٹ اور اس زمانہ کے وزیر چندو لال کی باہمی سخت و پز کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اور جہاں تک میں تحقیق کرسکا ہوں اس انتظام کے لئے نظام اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی جانب سے کوئی راست منظوری ریکارڈ پر موجود نہیں ہے۔"[2]

۱۸۲۶ء میں جب کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے نواب سکندر جاہ کے ذاتی خزانہ سے روپیہ مانگا گیا تو انہوں نے اس کے دینے سے صاف انکار کردیا۔[3]
۱۸۳۳ء میں نواب ناصرالدولہ نے کنٹنجنٹ کی بقا کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔[4]
۱۸۳۴ء میں انہوں نے کرنل اسٹوارٹ (رزیڈنٹ سے باصرار کہا کہ جس طرح میرے دیوانی

ے[1] Hyderabad Affairs Vol. 11-p. 247.

ے[2] ,, ,, ,, p. 623.

ے[3] ,, ,, ,, p. 374.

ے[4] - ۱۹۵ میمو آئیز صفحہ

اِنتظام سے انگریز افسر ہٹا لئے گئے ہیں اسی طرح میری فوج سے بھی ان کو ہٹا لیا جائے۔ میری فوج کو اب کنٹنجنٹ کی حاجت نہیں ہے[1] جنرل فریزر (رزیڈنٹ اپنے ۲۶ جولائی ۱۸۴۲ء کے مراسلہ میں حکومتِ ہند کو اطلاع دیتا ہے کہ۔

اگر نظام کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا گیا کہ وہ فی الواقع خود مختار ہیں تو پہلا کام جو وہ کریں گے وہ یہ ہوگا کہ کنٹنجنٹ کی برطرفی کا مطالبہ کریں گے جس سے انکی ناراضی معلوم ہے اور جس کے قیام اور دائمی بقا کے لئے کسی موجود الوقت معاہدہ میں کوئی شرط موجود نہیں ہے[2]

۱۸۵۳ء میں جب معاہدہ تفویض برار کے لئے برطانی رزیڈنٹ کرنل لو نواب ناصرالدولہ سے گفت و شنید کر رہا تھا تو نواب ناصرالدولہ نے پھر اس امر واقعہ کا اعادہ کیا کہ کنٹنجنٹ کا قیام نواب سکندر جاہ کی اجازت کے بغیر عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آخری جنگ مرہٹہ (۱۸۱۷ء) کے بعد سے کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں ہماری مدد کی ضرورت ہوتی۔ کرنل لو نے جواب دیا کہ یہ فوج آپ کے والد صاحب کی اجازت سے قائم کی گئی ہے۔ نواب نے فرمایا کہ "میرے والد کا نام نہ لو یہ کہو کہ مہاراجہ کی اجازت سے قائم کی گئی ہے[3] نواب ناصرالدولہ کے اِس استدلال کے جواب میں کرنل لو اور خود لارڈ ڈلہوزی نے اس وقت یہ دلیل پیش کی تھی کہ جب نواب سکندر جاہ نے مہاراجہ چندو لال کو مختار کل بنا دیا تھا تو مہاراجہ

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۹۰۔

[2] Hyderabad Affairs Vol. p. 576.

[3] Hyderabad Affairs Vol. 11 p. 375.

کی منظوری خود نواب کی منظوری تھی لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ سر چارلس مٹکاف جیسا مستند اور معتبر شخص جو نواب سکندر جاہ کے زمانہ میں پانچ سال تک سلطنتِ برطانیہ کا رزیڈنٹ رہ چکا ہے۔ بالفاظ صریح اس کا اعتراف کرتا ہے کہ انگریزی حکومت نے زبردستی نواب سکندر جاہ کو بے اختیار کیا اور اُن کی مرضی کے خلاف اُن کے وزراء کو استعمال کرتی رہی۔ ۳۰ اور ۱۸ اگست ۱۸۲۹ء کی ایک تحریر میں یہ نامور برطانی مدبر لکھتا ہے:۔

"۱۸۰۰ء کے عہدنامہ کے بعد ہی سے یہ ضروری سمجھ لیا گیا تھا کہ ریاست کا وزیر ہمارے مفید مطلب ہونا چاہیئے اور ہمیں اپنے اثر سے اس کی تائید کرنی چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے رزیڈنٹ نے ہز ہائی نس (نواب سکندر جاہ) کو ان کی تخت نشینی کے وقت اپنا مقصد صاف بتا دیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ آرسطو جاہ مرتے دم تک وزیر رہے۔ اور اس تمام مدت میں اُنہوں نے اپنے آقا یعنے نظام حال کو بے دست حلقہ بگوش اور محروم الاقتدار رکھا۔ وزیر کی وفات پر نظام نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ معاملات سلطنت کو خود انجام دینا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر کوئی مطلق العنان وزیر اِن پر مسلط کیا جائے مگر جو انتظام وہ چاہتے تھے اس پر جہازی گورنمنٹ کو اعتراض تھا، ہم نے اصرار کیا کہ ایک وزیر کامل اختیارات کے ساتھ مقرر کیا جائے ہم نے اپنا حق جتایا کہ وزیر ہمارے مفاد سے وابستہ اور ہمارا منتخب کردہ ہونا چاہیئے اور اگر ضرورت ہو تو ہمیں اس کے تقرر پر زور دینا چاہیئے مگر انتہائی کارروائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"میر عالم جن کو ہم نے منتخب کیا تھا۔ وزیر مقرر کر دیئے گئے اور مرتے دَم تک اپنے آقا کی مملکت کے بلا شرکت اغیارے حکمران رہے۔ نظام نے خود اپنی سلطنت میں اختیارات کا کچھ حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر یہ وزیر کو گوارا نہ تھا اور رزیڈنٹ اس کی مدد پر تھا۔ آخر نظام شکستہ خاطر ہو کر دست کش ہو گئے۔ اور اس وقت سے انہوں نے سلطنت کے معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ گوشۂ عزلت میں افسردہ و غمگین زندگی بسر کرتے رہے اس طرح ہمارے اثر نے حیدرآباد کے وزیر کو اس کے اپنے آقا کی مرضی کے خلاف مطلق العنان حکمران بنا دیا برطانی مفاد کی تمام معاملات میں وہ برطانی رزیڈنٹ کا تابع فرمان تھا ..... اس کی مخالفت کو ہمارے خلاف دشمنی اور انگریزی سلطنت کے ساتھ بیوفائی سے تعبیر کیا جاتا تھا"

"میر عالم کے انتقال کے بعد نظام نے دوبارہ اپنے امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا مگر بے نتیجہ۔ ان کو ایک وزیر مقرر کرنے پر مجبور کیا گیا اور غیر معمولی انتظام عمل میں آیا کہ نظام کے منتخب کردہ شخص منیر الملک کو عہدۂ وزارت دیا گیا۔ مگر یہ شرط کر لیگئی کہ ریاست میں ان کے اختیارات کچھ نہونگے تمام اختیارات نائب وزیر چندو لال کو دیئے گئے جو ہمارے زیر اثر تھے۔ چنانچہ اس وقت سے ہماری مداخلت کی بدولت رئیس وقت خود اپنی سلطنت کے معاملات سے الگ کر دیا گیا، وزیر اعظم بھی اسی طرح الگ بٹھا دیا گیا اور حقیقی وزیر کامل طور پر ہمارا تابع فرمان ہو گیا"

"اپنے اثر اور عمل و دخل کو بڑھانے کے سلسلہ میں ہمارا دوسرا قدم یہ تھا کہ ہم نے نظام کی نوج کو ہٹا کر اس کی جگہ خود اپنی فوج کو رکھنا شروع کر دیا جو برطانی

افسروں کے ماتحت قائم کی گئی تھی ..... ہم نے اسکی عمومی نگرانی اور تنظیم سے ابتداً کی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اب نظام کے خزانہ سے ۴۰ لاکھ سے اوپر رقم ایک ایسی فوج پر خرچ ہوتی ہے جو کلیتہً برطانی افسروں کے زیر قیادت ہے اور جس پر برطانی رزیڈنٹ کو بلا شرکت احدے کلی اختیارات حاصل ہیں۔ یہ انتظام صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وزیر ہمارا بالکل تابعدار ہے کیونکہ اس کارروائی کو دربار اور قومی فوج کے افسروں کے لئے قدرتی طور پر سخت ناگوار خاطر ہونا چاہیئے[1]

۱۴ اگست ۱۸۲۶ء کی ایک اور تحریر میں مٹکاف لکھتا ہے۔

" نظام نے اپنے شاہی حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوشش کی، اس کو زبردستی دبا یا گیا۔ رئیس وقت خود اپنی مملکت میں محض ایک سرکاری وظیفہ خوار کی حیثیت رکھتا ہے اس کا دماغ غالباً فطری طور پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ناقابل نہیں ہے مگر ممکن ہے کہ طویل عرصہ تک افسردہ اور گوشہ نشین زندگی بسر کرنے کے باعث متاثر ہو گیا ہو ..... میں اس رئیس کی حالت سے زیادہ قابل رحم اور اس سے زیادہ ناقابل الزام حالت کا تصور نہیں کر سکتا جسے اس طرح خود اپنے ملازم کا ماتحت بنا دیا گیا ہو، اور ایک خارجی طاقت اس ملازم کی حامی بن گئی ہو نظام کے ممالک محروسہ میں اس قسم کی فوج (یعنی کنٹیجنٹ) کا رزیڈنٹ کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا اور خود نظام کے خرچ پر نظام کے دبانے کا ذریعہ بننا حیدرآباد کے وزیر کی تابعداری ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے[2]"

یہ کسی اور کے نہیں خود برطانی حکومت کے ایک سابق رزیڈنٹ کے

---

[1] Hyderabad Affairs Vol. p. 299-300.

[2] ,, ,, ,, p. 375.

اعترافات ہیں جن سے اس امر کا ناقابل تردید ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ نواب مغفرت منزل سکندر جاہ بہادر کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی اور معاہدات کے بالکل خلاف ریاست پر یہ بار محض ایک پیشکار کی رضامندی سے ڈالدیا گیا جسے خود انگریزی حکومت نے، نہ کہ ملک کے جائز حکمران نے ریاست کا مختار کل بنا دیا تھا۔

کنٹنجنٹ کی اصلیت

اب رہا یہ سوال کہ اس فوج کے قیام کا اصلی مقصد کیا تھا اور وہ کہاں تک جائز بنیاد پر رکھی گئی تھی سو اس کے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ کہے بغیر میں خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے بیانات یہاں نقل کرتا ہوں۔

۲۴ راپریل ۱۸۴۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائرکٹر مسٹر سیمیں لالونگٹن نے حیدرآباد کے متصرم رزیڈنٹ کرنل لو کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ

"میں کچھ عرصہ سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بڑی حد تک ہم خود نظام کی مالی مشکلات کے باعث ہیں ہم نے نظام پر ایسے مطالبات کا بار ڈالدیا ہے جن کے ہم کسی معاہدہ کی رو سے مستحق نہیں ہیں۔ ۱۲ راکتوبر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارہویں دفعہ کی رو سے نظام نے اپنے اوپر اس بات کا ذمہ لیا تھا کہ جنگ کے موقع پر وہ ۶ ہزار پیدل اور ۹ ہزار سوار دیں گے جس کو کنٹنجنٹ فورس کا نام دیا گیا تھا یہ فوج رزیڈنٹ کی درخواست پر ۱۸۰۳ء میں مہیا کی گئی اور اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگ میں عمدہ خدمات انجام دیں مگر دوسرے سال جو فوج مہیا کی گئی وہ تعداد اور

اہلیت کے لحاظ سے اتنی ادنیٰ تھی کہ رزیڈنٹ کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ نظام کی ملازمت میں برطانی افسروں کے ماتحت ایک باقاعدہ رسالہ قائم کیا جائے ۱۸۰۸ء میں اصلاح کا ایک خاکہ منظور کیا گیا اور اس پر عمل درآمد ہوا۔ پھر ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۶ء میں مزید اصلاحات کی گئیں، یہاں تک کہ ۱۸۵۰ء کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کینٹجنٹ میں ۲۵۹۲ سوار، ۶۸۳۵ پیدل، اور ۹۵ یوروپین افسر ہیں جنکا نظام کی حکومت پر ۴۲ لاکھ روپیہ (حالی) سالانہ خرچ ڈالدیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ ریاست کی کل آمدنی کا ۱/۵ حصہ ہضم کر جاتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نظام اس وقت ان رقوم کے قرضدار ہیں جو برٹش گورنمنٹ نے کینٹجنٹ کے مصارف کیلئے انکو قرض دی ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں یقیناً یہ رائے رکھتا ہوں کہ کینٹجنٹ کی برطرفی پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نہ اس کا ابتدائی قیام کسی معاہدہ پر مبنی ہے اور نہ استمراری تھا۔[۱]

اس کے جواب میں کرنل لو[۲] نے ۲۴ جون ۱۸۴۸ء کو ایک خط لکھا جس کے بعض خاص حصے یہ ہیں۔

"میں نے ۱۸۳۸ء میں لارڈ آک لینڈ کے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر کالون کو جو نیم سرکاری خط لکھا تھا اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اس جرم بیرحمی کے متعلق آپ کی رائے سے کس قدر متفق ہوں جس کا ارتکاب ہم سالہا سال سے

---

[۱] میموائیر ز صفحہ ۲۴۴

[۲] یہ وہی کرنل لو ہے جو ۱۸۵۳ء میں حیدرآباد کا رزیڈنٹ بنایا گیا اور جس نے نظام پر فوجی قوت کا دباؤ ڈالکر تفویض برار کے عہدنامہ پر دستخط حاصل کئے۔

حکومت نظام کے ساتھ انکی آمدنی پر کنٹنجنٹ کی تنخواہ کے لئے ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ
کا خرچ عائد کرنے کی صورت میں کر رہے ہیں جو دوسرے الفاظ میں خود ہماری
ہی اغراض کے لئے ہے نہ کہ نظام کی اغراض کے لئے ۱۸۱۹ء سے دکن میں کامل
امن ہے اور چونکہ ہم صرف حالت جنگ میں نظام کی فوج سے ۶ ہزار پیدل اور
۹ ہزار سوار مانگنے کا حق رکھتے ہیں اس لئے از روئے معاہدہ ہم کو اس پوری
مدت یعنی ۲۸ برس سے زیادہ کی مدت میں کنٹنجنٹ کے لئے نظام سے ایک روپیہ
بھی مانگنے کا حق نہ تھا مگر اس مدت میں ہم نے نظام کے خزانہ سے (ماسوا اس
۴۲ لاکھ کے جو اب کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں قرض کے طور پر نظام کے ذمہ واجب الادا ہے)
۱۱ کروڑ ۲۰ لاکھ حالی کی رقم خطیر کھینچ لی ہے جس کا ایک بڑا حصہ نظام کے ممالک محروسہ
سے ہمیشہ کے لئے سپاہیوں اور افسروں کی ترسیل زر وپس انداز کی صورت میں باہر
چلا گیا ہے کیونکہ ان سپاہیوں اور افسروں کا بیشتر حصہ اودھ، روہیلکھنڈ اور دوسرے اقطاع
ہندسے آیا ہوا ہے جو اپنے بچائے ہوئے روپے کو زر نقد کی صورت میں دور دراز علاقوں
کو لیجاتے ہیں اور اس طرح یہ دولت کی نکاسی نہ صرف نظام کے خزانہ کو خالی کئے
دیتی ہے بلکہ ان کی رعایا کو بھی روز بروز مفلس بنا رہی ہے ..... مجھے یاد ہے
کہ میں نے ۱۸۳۵ء میں مسٹر کالون کو بتایا تھا کہ ۱۸۱۹ء سے ابتک موجودہ فوج کا
نصف حصہ ۲۰ لاکھ کے خرچ پر وہی خدمات حکومت نظام کے لئے انجام دے سکتا تھا
جو موجودہ فوج ۴۰ لاکھ کے خرچ سے انجام دے رہی ہے۔ برسوں سے کنٹنجنٹ
کے ایک بڑے حصہ سے کوئی کام نہیں لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں معاہدہ کی
رو سے نظام کو کمپنی کی جمعیت تعلقبندی سے ہر وہ خدمت لینے کا حق ہے

جو کنٹیجنٹ سے لی جاتی ہے یا لیجا سکتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اگر ۱۸۱۹ء سے صرف ۱۲لاکھ کی فوج رکھی جاتی تو کیا ہوتا۔ بالکل ظاہر ہے کہ ابتک ہم نظام کے خزانے سے اس رقم کی بہ نسبت جو ابتک ہم نے وصول کی ہے ۵کروڑ کم وصول کرتے یہ فرق تو نظام کے حق میں ہوتا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں کیا ہوتا؟ میری رائے یہ ہے کہ کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ ۱۸۱۹ء سے ہم نے ایک مرتبہ بھی کنٹیجنٹ کو نظام کے حدود سے باہر استعمال نہیں کیا ہے ...... اس کے بعد اس بارے میں اور کیا کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ دیسی حکومت اپنے بھاری قرضوں اور خالی خزانہ کے باعث کیوں قریب قریب معطل سی ہوگئی ہے [۹۱]

کورٹ آف ڈائرکٹرز کا ایک دوسرا رکن سر ہنری ولاک اپنی ۹ر نومبر [illegible] کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ

"نظام کی بہترین بے قاعدہ فوج کو رفتہ رفتہ ہم نے اپنی نگرانی میں ایک باقاعدہ کنٹیجنٹ کی صورت دیکر نواب کو ان لوگوں کی خدمات سے محروم کر دیا جو ان کے ذاتی محافظ تھے اور جن کی قوت پر تحصیل اور پولیس کے افسر مالگذاری وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے کام میں بھروسہ کر سکتے تھے۔ اس طرح ہم نے نظام کو مجبور کر دیا کہ وہ نظم و نسق کو چلانے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیئے پٹھانوں، روہیلوں اور عربوں کی ایک نہایت قابل اعتراض فوج بھرتی کریں۔" [۹۲]

---

۹۱ میموآئیرز صفحہ ۲۴۸

″ ″ ۴۹

۹۲ ″ ″ ۳۶۰

کورٹ کا ایک اور رکن جنرل کالفیلڈ (Caulfield.) لکھتا ہے۔

"ہم نے نظام پر ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا ایک غیر ضروری خرچ ایک ایسی کنٹجنٹ کی پرداخت کے لئے عاید کر دیا ہے جسکی تنظیم و ترتیب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس پر ہمارے ہی افسر مقرر ہیں اور جس کا وہی کام ہے جو معاہدہ کی رو سے جمعیتہ تعلقبندی کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہم نے نظام کو جمعیت تعلقبندی کی خدمات سے ایسے وجوہ کی بنا پر محروم کیا ہے جنکی حمایت میں کوئی عذر پیش کیا جا سکتا" [۵۱]

کنٹجنٹ کا بانی سرہنری رسل لکھتا ہے کہ:-

"یہ فوج صرف برائے نام نظام کی ملازم تھی۔ اس کو ہر مہینہ رزیڈنٹ کے خزانہ سے باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اور وہ اپنے آپ کو کمپنی ہی کی فوج سمجھتی تھی عملی اغراض کے لئے یہ فوج بھی ہمارے لئے ایسی ہی تھی جیسی خود ہماری فوج اور اس کو بھی ہم اپنی فوج کی طرح کام میں لا سکتے تھے" [۵۲]

سنہ ۱۸۱۰ء میں جب رسل نے اس فوج کے قیام کی تجویز پیش کی تھی تو اس وقت بھی اس نے اپنے ۲۲ جون کے مراسلہ میں صاف لکھ دیا تھا کہ یہ فوج جمعیتہ تعلقبندی (سب سڈیری فورس) کو اس محنت سے بچانے کے لئے مطلوب ہے جو اسے سرکش رعایا کی سرکوبی میں کرنی پڑتی ہے [۵۳] حالانکہ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں نظام نے اسی مقصد کے لئے برٹش گورنمنٹ کو ۶۳ لاکھ کا ملک دیکر جمعیت

---

[۵۱] میمو آئیرز صفحہ ۲۶۰

[۵۲] Hyderabad affairs Vol. 11. P. 322

[۵۳] " " P. 372

تعلقبندی قائم کرائی تھی۔

پھر جس وقت کنٹجنٹ کو منتقل کیا جا رہا تھا تو خود گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۰ر نومبر ۱۸۱۹ء کی یادداشت میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ فوجیں اس بادشاہ کی نسبت جس کے خرچ پر وہ رکھی جا رہی ہیں، درحقیقت زیادہ تر ہماری فوجیں ہیں اگرچہ ان کا خرچ نظام دیتے ہیں اور برائے نام وہ انکی طرف منسوب ہیں مگر ان کا ہمارے ذریعے تنخواہ لیا پانا، اور برطانوی افسروں کی قیادت میں رہنا اس بات کی توقع کی گنجائش رکھتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کسی ناچاقی کی صورت میں وہ اپنے ظاہری آقا کے مقابلے میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ اب کیا یہ عقل و خرد کے مطابق ہوگا اور کیا یہ اس اعتماد کے لئے جو آنریبل کمپنی نے ہم پر کیا ہے مناسب ہوگا کہ ہم ایسی ایک ضمانت کو انصاف کے ایک اعتقادی نکتہ پر قربان کر دیں ...... یہ بالکل خلاف مقتضائے سیاست ہوگا کہ ہم ضرورت سے زیادہ تہذیب کا خیال کر کے اپنی طاقت میں اس مفت کے اضافہ کو خواہ مخواہ چھوڑ دیں[۵۱]"

۷ر جنوری ۱۸۴۱ء کو کنٹجنٹ کے انگریز افسروں کی تنخواہوں کا مطالبہ کرنے کی قانونی مشکلات بیان کرتے ہوئے انگریزی رزیڈنٹ فریزر لکھتا ہے۔

"یہ فوج خود صبر و تحمل پر جی رہی ہے اگر اس پر فیصلہ کن اعتراضات کئے گئے تو خواہ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے اصرار کرنے پر قادر ہوں مگر ہمیں اپنے اس

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۵۷

اصرار کو موجود الوقت معاہدات کا حوالہ دیکر یا کسی ایسے سمجھوتہ کو پیش کر کے جو ان پائے ہیں ہمارے اور ہز ہائی نس نظام کے درمیان ہوا ہو حق بجانب ثابت کرنا مشکل ہوگا اسلئے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ایسی تجاویز پیش کرنے سے احتراز کیا جائے جنکو یہ دیسی ریاست یقیناً حق بجانب نہیں سمجھتی اور جن سے ایسے مسائل اور مجوزات پیش ہونے کا امکان ہے جو خود اس فوج کے نفس وجود کے متعلق ہوں گے۔" (میمو آئنرز صفحہ ۹۰)

اس کے بعد فریزر نے ۱۴ جولائی ۱۸۴۲ء کو پھر لکھا ہے کہ :-

"اگر ہم نے نظام پر یہ اثر قائم ہو جانے دیا تو یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ علاوہ دوسری خرابیوں کے ہم کو اس بزرگ تر خرابی کا مقابلہ کرنا پڑے گا کہ ہز ہائی نس کی جانب سے کنٹیجنٹ کی برطرفی کی تجویز پیش کی جائے گی جس سے انکی ناراضی معلوم ہے اور جس کے نہ ابتدائی قیام کیلئے کسی معاہدہ میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مسلسل برقرار رکھنے کیلئے ۱۸۳۳ء میں ہز ہائنس نے اس فوج کے برقرار رہنے پر فعلاً اعتراضات کئے تھے اور اس پر جو مصارف ہو رہے ہیں وہ دیوان کی طرف سے پیہم شکایات کے موجب ہیں۔" (میمو آئنرز صفحہ ۱۶۵)

خود لارڈ ڈلہوزی جس نے اسی کنٹیجنٹ کی خاطر نظام سے زبردستی ملک برار حاصل کیا۔ اپنی ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ

"ان وجوہ کی بناء پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ حکومت ہند کو نہ تو معاہدہ ۱۸۰۰ء کی اسپرٹ سے اور نہ الفاظ سے اس کا کوئی حق پہنچتا ہے کہ نظام سے کنٹیجنٹ کو اسکی موجودہ شکل میں

قائم رکھنے کا مطالبہ کرے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک ایماندار آدمی ہونے کی حیثیت سے ریزیڈنٹ کو یہ ہدایت دینے کے لئے ہرگز راضی نہیں ہوں کہ وہ نظام کے جواب میں یہ کہے کہ کنٹیجنٹ ۱۸۱۶ء سے اب تک ان کے خرچ پر اس وجہ سے رکھی گئی ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارھویں دفعہ کی رو سے وہ اس کے رکھنے کے پابند ہیں"۔ [۵۱]

۱۴ ستمبر ۱۸۵۲ء کو لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ایک پرائیوٹ خط میں جنرل فریزر کو لکھا تھا کہ:-

"گورنمنٹ آف انڈیا بار بار از روئے معاہدہ کنٹیجنٹ رکھنے کی ذمہ داری کا ذکر کرتی ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے نظام نے معاہدہ ۱۸۰۰ء کی بارھویں دفعہ کی اس تعبیر کو قبول کر لیا ہے [۵۲] لیکن اگر نظام اس سے مکر جائیں اور از روئے معاہدہ کسی پابندی کے وجود سے انکار کر دیں تو میں ایک پبلک مین کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں ایمانداری کے ساتھ یہ استدلال نہیں کر سکوں گا کہ کنٹیجنٹ کو برقرار رکھنے کے لئے سابقہ عمل کے سوا کوئی اور بھی حجت موجود ہے۔ میں یہ استدلال کر سکتا ہوں اور یہی میں نے کیا ہے"

---

[۵۱] میمو آئرز صفحہ ۳۶۰

[۵۲] یہ بھی غلط ہے کہ نظام نے اس تعبیر کو قبول کر لیا۔ خود جنرل فریزر (ریزیڈنٹ) نے اس خط میں لکھ دیا تھا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے اکتوبر ۱۸۵۰ء سے پہلے نظام نے کبھی صریح الفاظ میں اس جواب کو قبول نہیں کیا (دیکھو میمو آئرز صفحہ ۳۸۱)

کہ ہز ہائینس کے طرز عمل (یعنی خاموشی) نے معاہدہ کو یہ صورت دیدی ہے
اور جب تک اسے نامنظور نہ کر دیا جائے ان پر یہ واجب ہے کہ سیدھی
طرح اس فوج کا خرچ برداشت کریں۔ جس کو اسی تعبیر کے مطابق انہوں نے
ہمیں مرتب کرنے دیا ہے لیکن اگر وہ نفس معاہدہ پر قائم ہو جائیں تو میں یہ
استدلال نہیں کر سکتا کہ معاہدہ کی اسپرٹ یا الفاظ کی رو سے وہ اس
بناء پر حالت امن میں ۹ ہزار کی ایک گراں خرچ فوج رکھنے پر مجبور ہیں کہ
حالت جنگ میں انہوں نے ۱۵ ہزار فوج دینے کی ذمہ داری لی ہے"۔

اپنی ایک اور خفیہ تحریر میں لارڈ ڈلہوزی لکھتا ہے۔

"عہد نامہ کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ نظام کو اپنی فوج سے الگ ایک
فوج بھرتی کرنے اور اس کا خرچ دینے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہر وقت
زمانۂ امن اور زمانہ جنگ میں یکساں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے تنہا تصرف
میں دیدی جائے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ میں نے کہتے سنا ہے کہ ہز ہائینس
کی اپنی فوج محض ایک "انبوہ" ہے[لہ] ۔ اور یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں اچھی

لہ ۔ عجیب لطیفہ یہ ہے کہ انہی لارڈ ڈلہوزی صاحب نے ۷ ۱ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو اپنے
ایک سرکاری مراسلہ میں لکھا تھا کہ :۔

"۱۸۰۰ء کے عہد نامہ نے ہم کو ہر وقت نظام سے ۱۵ ہزار فوج طلب کرنے کا حق دیا تھا۔
تجربہ نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ جب کبھی یہ مطالبہ کیا گیا ہم کو ۱۵ ہزار فوج تو نہ ملی البتہ بہت سا
بیکار اور بے ضابطہ "انبوہ" مل گیا۔ پس ہم نے بالکل صحیح اور جائز طور پر عہد نامہ کو یہ معنی پہنائے
کہ ہم کو کارآمد سپاہیوں کی مقررہ تعداد مہیا کی جانی چاہیئے اس لئے ہم غیر مشکوک انصاف

فوج ملنے کا اطمینان کرنے کے لئے ہم یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ
ایک کثیر تعداد کی فوج حالت امن میں ہمارے زیر نگرانی و زیر ترتیب ہے
تو میں جواب دوں گا کہ معاہدہ کی دفعہ ہم کو یہ معنی پہنانے کا کوئی حق نہیں
دیتی (میمو آئرز صفحہ ۴۲۶)

ان سرکاری اور نیم سرکاری تحریروں کے بعد کنٹیجنٹ کی اصلیت کے متعلق ایک حرف بھی زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان تسلیم کرتے ہیں کہ کنٹیجنٹ خلاف معاہدہ قائم کی گئی۔ نظام کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی اور انہی اغراض کے لئے قائم کی گئی جن کے لئے اس سے پہلے ۶۳ لاکھ کا ملک نظام سے لیکر سب سیڈیری فورس قائم کی گئی تھی۔

کنٹیجنٹ کے مسرفانہ مصارف

آگے چلکر اس کنٹیجنٹ کے مصارف کی خاطر نظام پر جو مصیبتیں نازل کی گئیں۔ ان کو بیان کرنے سے پہلے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت ۴۰ سال تک اپنے وفادار دوست کے خزانہ سے روپیہ لیکر اس فوج پر کس بے دردی کے ساتھ خرچ کرتی رہی اس کے لئے بھی ہم اپنی طرف سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) کے ساتھ ہزہائی نس سے یہ مطالبہ کر سکتے اور کرتے ہیں کہ وقت ضرورت سے پہلے ہی ایسی تدابیر اختیار کریں کہ ایک باضابطہ فوج فراہم کر رکھیں جس کا خرچ وہ دیں اور افسر ہمارے ہوں اور وہ دکن کے وسطی اضلاع میں قیام امن کا کام دے۔ اس کام کیلئے ہم ۱۵ ہزار کے بجائے صرف ۹ ہزار مانگتے ہیں۔" (میمو آئرز آف فریزر صفحہ ۳۵۲)
اس مراسلے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کی سیاست کے خفیہ و علانیہ پہلوؤں میں کس قدر فرق تھا۔

ایک لفظ کہنے کی بجائے خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے اعترافات کو نقل کروں گا۔

۲۰ جولائی ۱۸۴۵ء کو کرنل لو (منصرم رزیڈنٹ) نے حکومت نظام کی مالی مشکلات کے متعلق ایک طویل مراسلہ گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا جس میں اس نے کنٹنجنٹ کے بھاری اخراجات کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا:

"یہ خیال کرکے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ حکومت نظام کی ان شدید مالی مشکلات کا ایک معتدبہ حصہ بالواسطہ خود ہمارے اس چالیس لاکھ روپیہ سالانہ کے مطالبہ کی بدولت اس پر نازل ہوا ہے جو ہم کنٹنجنٹ فورس کے مصارف کے لئے کرتے ہیں۔"

نظام کی کنٹنجنٹ کے متعلق ان تمام واقعات اور حالات کو بیان کرنا درحقیقت میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے مگر میں جب سے یہاں آیا ہوں میں نے اس حکومت کی مالی پریشانیوں کو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر دیکھا ہے کہ میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے سامنے پیش کرنے کے لئے اپنی رائے صاف صاف ظاہر کردینا ضروری فرض سمجھتا ہوں اور اسی اصول پر میں اس اظہار رائے کے ساتھ اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کو ایسی ایک رقم تک کم کردینے کے لئے جو حد سے حد ۲۰ لاکھ روپیہ (حالی) سالانہ سے زیادہ نہ ہو، ضروری کارروائی بعجلت ہونی چاہیئے کیونکہ پہلے خواہ کچھ صورت رہی ہو مگر اب مجھے بالکل ظاہر نظر آرہا ہے کہ حیدرآباد کی حکومت وہ بھاری رقم نقد روپے کی صورت میں کسی طرح دینے کے قابل نہیں ہے جو اس فوج کو رکھنے

سکے لئے مطلوب ہے میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس پیہم زرپاشی کا سلسلہ
مزید تین سال تک بھی جاری رہا تو وہ اس دارالسلطنت کی مصیبت اور
انتشار میں بہت شدید اضافہ کا باعث ہوگا اور غالباً تمام نظم و نسق کے
کارخانہ کو معطل کر دے گا" ۵۱

اس کے جواب میں ۷ ر اکتوبر ۱۸۴۹ء کو لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے کرنل لو کو لکھا کہ
"ہز لارڈ شپ با جلاس کونسل کرنل لو سے اس بات پر متفق ہیں کہ ہم نے
کنٹنجنٹ کو نظام کے مالیات پر اتنا بھاری بوجھ بنا دیا ہے جتنا اسکو نہ ہونا
چاہئے گورنر جنرل با جلاس کونسل کی رائے میں اسٹاف بلا فائدہ زائد ہے اور تنخواہیں
جتنے اور مختلف قسم کے مصارف اس سے بدرجہا زائد ہیں جتنے ہونے چاہئیں" ۵۲

۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لارڈ ڈلہوزی نے دوبارہ اس فضول خرچی کا
ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"میں اس اعتراض کے حق بجانب ہونے کو سختی کے ساتھ محسوس کرتا ہوں جو
اس فوج کے بھاری خرچ پر کیا جا سکتا ہے .... یہ فوج کم نہ زیادہ
اکٹھے ۵ برگیڈیر رکھتی ہے جن کے ساتھ اسی نسبت سے برگیڈ میجر بھی ہیں حالانکہ
گوالیار کنٹنجنٹ جو ہز ہائی نس (نظام) سے ایک ہزار کم آدمیوں پر مشتمل ہے۔ صرف
ایک برگیڈیر رکھتی ہے اور باقی عملہ بھی اسی تناسب سے بہت کم ہے" ۵۳

---

۵۱ ہیمو آنرز صفحہ ۲۵۵

۵۲ ″ ″ ″ ۳۵۳

۵۳۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو لارڈ ریڈنگ نے اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر کے

(باقی صفحہ ۵۸)

اکتوبر ۱۸۴۸ء میں کرنل لو کے پیہم اصرار پر لارڈ ڈلہوزی نے اس خرچ میں کمی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

"مزید برآں گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات کے لئے بالکل تیار ہیں کہ فوج کے اسٹاف میں بہت سی گراں خرچ اسامیوں کو تخفیف کر دیں اس طرح کہ جب کوئی جگہ خالی ہو یا موقع پیش آئے تو اسکو موقوف کر دیں گورنر جنرل باجلاس کونسل نہیں سمجھتے کہ فی الحال اس سے زیادہ کچھ کیا جا سکتا ہے"

اس کے بعد ۸ ردسمبر ۱۸۴۹ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے حکومت ہند کو یہ ہدایت کی گئی کہ۔

"اگر کنٹنجنٹ نظام کے مالیات پر اس سے زیادہ بار ڈالتی ہے جتنا اس کی اہلیت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے تو نظام کو ایسے غیر ضروری بار سے فوراً نجات دینی چاہیئے"

۴ ردسمبر ۱۸۵۱ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے پھر لکھا کہ

"کنٹنجنٹ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مصارف کی عام نظر ثانی کر کے گورنمنٹ آف انڈیا کو نظام کے سامنے تخفیف مصارف کی ایک مثال پیش کرنی چاہیئے جو ان کے مالیات کے لئے اس وقت سخت ضروری ہے"۔ [1]

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۳۵۶

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷) جواب میں جو خط لکھا تھا اسمیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس فضول خرچی کو تسلیم کر لیا جائے تو اسکی ذمہ داری تنہا برٹش گورنمنٹ پر نہیں ڈالی جا سکتی جس فوج کا سارا انتظام برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھا اسکی بد انتظامی کی ذمہ داری سے برٹش گورنمنٹ کو سبکدوش قرار دینا صرف سلطنت برطانیہ کے لارڈ چیف جسٹس ہی کا کام ہو سکتا ہے کسی اور کو یہ سعادت حاصل ہونی مشکل ہے۔

لیکن ان پیہم ہدایات اور خود لارڈ ڈلہوزی کے اپنے وعدے کے باوجود ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک کنٹنجنٹ کے خرچ میں جس قدر کمی کی گئی اس کی کیفیت ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء میں کنٹنجنٹ کی قوت حسب ذیل تھی۔

سال	یورپین افسر	نان کمیشنڈ افسر	سوار	پیدل	توپیں	شاگرد پیشہ	[illegible]
۱۸۴۹ء	۷۹	۹۰	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۷	۸۸۱	۴۴،۲۵،۰۷۷
۱۸۵۳ء	۷۹	۸۲	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۶	۸۸۱	۳۸،۳۰،۰۰۰

اسی کے متعلق سر ہنری ولاک نے ۱۸۵۹ء میں ایک سخت اختلافی نوٹ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ

"مذکورۂ بالا ہدایات جاری ہونے کے بعد سے نظام کی پریشانیاں بڑھ گئیں اندرونی اضطرابات سے ان کے ملک میں انتشار پھیل گیا۔ کنٹنجنٹ کی خدمات ان کو پیش کرنے سے انکار کیا گیا حالانکہ وہ جائز طور پر انکو دیجا سکتی تھیں۔ آمدنی میں مزید کمی ہو گئی۔ کنٹنجنٹ کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ مگر کورٹ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کنٹنجنٹ کے اسٹاف میں اسامیاں خالی ہوئیں اور گورنر جنرل نے ان کو بھر دیا۔ حیدرآباد کے رزیڈنٹ بڑے بڑے عالی پایہ افسر سر چارلس مٹکاف کرنل اسٹیوارٹ، جنرل فریزر اور کرنل لو یکے بعد دیگرے باوقات مختلف اظہار کرتے رہے کہ ہم از روئے معاہدہ

نظام کے خزانے پر اتنے بڑے بڑے مطالبات کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں
اور یہ کہ کنٹنجنٹ کے بارے بڑی حد تک اس مالی پریشانی کو پیدا کیا ہے جو
اس وقت ریاست کی طاقت کو خطرہ میں مبتلا کئے ہوئے ہے''[1]

لیکن عجیب لطف ہے کہ جو تخفیف ۱۸۴۸ء سے بلکہ صحیح یوں ہے کہ ۱۸۱۹ء
سے ۱۸۵۳ء تک نہ ہو سکتی تھی۔ وہی تخفیف برار لینے کے بعد پہلے ہی سال ممکن
ہو گئی اور ممکن بھی اس حد تک کہ جس فوج پر ۳۸ لاکھ روپئے کلدار صرف ہوتے تھے
اسی پر ۱۷ لاکھ اور حد سے حد ۲۴ لاکھ روپے سالانہ خرچ ہونے لگے یکم جنوری ۱۸۵۴ء
کو جب حیدرآباد کنٹنجنٹ کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو اس کا خرچ ۱۷ لاکھ رکھا گیا تھا۔
اور اس کے بعد کے اخراجات کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے۔

سال	یورپین افسر	نان کمیشنڈ افسر	سوار	پیادہ	توپیں	شاگرد پیشہ	خرچ سالانہ
۱۸۵۵ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۳	۲۴	۶۴۴	۲۳۶۵۴۱۸
۱۸۵۶ء	۴۹	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۲۲۷۲۰۳۲
۱۸۵۷ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۲۳۰۲۲۷۴

اب یہ بالکل ظاہر ہے کہ جتنی تخفیف معاہدہ برار کے بعد چار سال میں کی گئی اگر
اتنی ہی تخفیف معاہدہ سے پہلے چار سال میں کی جاتی تو کنٹنجنٹ کے خرچ میں ۶۰ لاکھ
کی کمی ہو جاتی اور بجائے اس کے کہ ۱۸۵۳ء میں حضور نظام پر کمپنی کا ۵۰ لاکھ روپیہ
قرض ہوتا۔ خود نظام کے خزانہ میں ۱۰ لاکھ روپیہ الٹا بچ رہتا۔

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۳۵۶

٦١

ملک ہضم کرنے کی تدبیریں

اوپر کے بیانات سے یہ معلوم ہوچکا کہ اس کنٹنجنٹ کی ولادت ناجائز طور پر ہوئی تھی۔ اور اسکی پرورش بھی انتہا درجہ کی فضول خرچی کے ساتھ کی جارہی تھی جس کا خود انگریزی حکومت کے ارکان کو اعتراف تھا۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ انگریزی ڈپلومیسی کے اس ناجائز بچہ کو کس طرح "یار وفادار" کا ملک غصب کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔

مسلسل تیس پینتیس سال کی بدنظمی اور روز افزوں انحطاط کو دیکھ کر برطانی مدبرین کا دل اس ریاست کو یا کم از کم اس کے زرخیز حصوں کو ہضم کرلینے کیلئے بے اختیار ہورہا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں لارڈ آکلینڈ نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کرنل اسٹیوارٹ کو جو ہدایات بھیجی تھیں ان میں لکھا تھا کہ کنٹنجنٹ کے قیام و بقا کو سب سے زیادہ اہمیت دو اور ان فوجوں کے مصارف کے لئے چند مخصوص اضلاع کا قبضہ حاصل کرنے کے مناسب مواقع تلاش کرنے میں کوتاہی نہ کرو[1]

۱۸۳۸ء میں جنرل فریزر کو جو ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا اور اس نے یہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے یہ رائے قائم کی کہ اب یہ لقمۂ تر اتنا نرم ہوچکا ہے کہ اس کو آسانی کے ساتھ نگلا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ۶؍ اپریل ۱۸۳۹ء کو لارڈ آکلینڈ کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے دوران میں وہ لکھتا ہے کہ

---

[1] میمو آنرز صفحہ ۸۹

"ازالۂ مرض کے لئے جزوی تدبیر کرنا میں لاحاصل سمجھتا ہوں۔ اس ملک کی حکومت کا عملاً اپنے ہاتھ میں لے لینے سے کم کوئی چیز میری رائے میں ان خرابیوں کا کافی علاج نہ ہوگی جو یہاں پھیلی ہوئی ہیں"۔ [۵۱]

فریزر کا خیال یہ تھا کہ کمپنی حکومت نظام کو ایک کروڑ روپیہ قرض دے اور اس کے عوض نہ صرف تمام ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے بلکہ عربوں، روہیلوں اور دوسری فوجوں کو بھی منتشر کر دے۔ لیکن اس وقت ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی موقع نہ تھا۔

اس کے بعد فروری ۱۸۴۳ء میں اسسٹنٹ رزیڈنٹ کیپٹن میلکم اور مہاراجہ چندولال کے درمیان یہ گفت و شنید ہوئی کہ کمپنی سرکار نظام کو ۷۵ لاکھ روپیہ قرض دے اور رائچور، بیڑ یا برار کے علاقوں میں سے کوئی حصہ لے لے۔ [۵۲] لیکن رزیڈنٹ اور مہاراجہ میں ناچاقی تھی اس لئے یہ معاملہ طے نہ ہو سکا۔ تاہم کمپنی کے ارباب حل و عقد کو اس تجویز سے حالات کا رخ معلوم ہو چکا تھا اسلئے اسی وقت سے آپس میں کھچڑی پکنی شروع ہو گئی کہ دکن کے زرخیز ملک پر کس طرح تصرف حاصل کیا جائے۔ ۳۱ مئی ۱۸۴۳ء کو کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ

"اگر اب کوئی مالی مصیبت نظام یا ان کے وزیر کو ہم سے مدد کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور کرے تو برٹش گورنمنٹ کی خدمات اس واضح شرط کے ساتھ پیش کر دیا

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۴۴

۵۲ 〃 〃 ۱۷۴

جائیں کہ وہ (یعنی برٹش گورنمنٹ) نظام کی جانب سے ان کے فائدے کی خاطر ملک کا نظم و نسق پورا کا پورا اپنے ہاتھ میں لیگی اور اگر ایسی صورت میں ہم نے انکی مملکت کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تو ہز ہائی نس کو صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس وقت واپس نہ کیا جائے گا جب تک ہماری حکومت اس امر کا اطمینان نہ کرے گی کہ نظام یا ان کے جانشین ملک کا عمدہ انتظام کرنے کے لئے مناسب بند و بست کرنے کے قابل پائے جائیں گے"[۵۱]

دوسری طرف لارڈ الن برو کلکتہ میں انہی امور پر غور کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نواب خود اپنے صرف خاص کے خزانہ سے روپیہ دینے پر راضی نہ ہوں گے اور برٹش گورنمنٹ ہی سے مدد طلب کرنا ضروری سمجھیں گے۔ ایسی صورت میں وہ انکی درخواست کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قرض کی ادائیگی کا پورا اطمینان ہو جائے اور اس اطمینان کی واحد صورت اس کے نزدیک یہ تھی کہ نظام کے تمام ممالک محروسہ کو برطانی انتظام میں لے لیا جائے اس غرض کے لئے کلکتہ میں ایک معاہدہ کا مسودہ بھی تیار کر لیا گیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ کمپنی نظام کو ایک ہزار روپیہ قرض دے گی اور اس کے عوض نظام اپنے تمام ممالک محروسہ کا انتظام برٹش رزیڈنٹ یا دوسرے کسی افسر کو جسے برٹش گورنمنٹ منتخب کرے، دیوان کی حیثیت سے سپرد کر دیں گے تا آنکہ اصل رقم مع ۵ فیصدی سود برٹش گورنمنٹ کو واپس نہ مل جائے اور برٹش گورنمنٹ کو اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ ہز ہائی نس اور ان کے جانشین ان ممالک

---

[۵۱] میمو آئیرز صفحہ ۱۸۸

کا انتظام ایسے طریقے سے کر سکیں گے کہ پھر اس قسم کی مالی مشکلات پیش نہ آئیں۔

اس مجوزہ معاہدہ کی سب سے زیادہ عجیب دفعہ یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کے انتظام سے ریاست کے مالیات میں جو بچت ہوگی اس کو برٹش گورنمنٹ خود اپنے تصرف میں لائے گی۔[1] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست پر برٹش گورنمنٹ کا دوامی قبضہ رہے گا کیونکہ جب تمام بچت گورنمنٹ لے لیتی تو ایک کروڑ کا قرض معہ سود ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہتی، اور جب قرض ادا نہ ہوتا تو ریاست کا واگذاشت ہونا معلوم۔

یہ تھا وہ جال جو "یار وفادار" کو پھانسنے کے لئے تیار کیا گیا تھا مگر خوش قسمتی سے جنرل فریزر اور مہاراجہ چندولال کے باہمی اختلافات بڑھ گئے یہاں تک کہ ۱۶ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ اپنی خدمت سے علیحدہ ہو گئے اور کمپنی سے قرضہ مانگنے کی نوبت نہ آئی۔ اگرچہ مہاراجہ نے سرکار نظام پر مختلف قسم کے جو قرضے چھوڑے تھے ان سب کو بھگتانے کے لئے ایک سرسری تخمینہ کے مطابق ۲ کروڑ روپیہ درکار تھا۔[2] لیکن نواب ناصر الدولہ نے اس حوصلہ شکن صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انگریزوں کی طرف استعانت کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ یہی واقعہ ہے جس کے متعلق لارڈ ڈالہوزی بڑے افسوس کے لہجے میں جنرل فریزر کو لکھتا ہے کہ

"میں سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ چندولال قطعی طور پر عہدہ سے

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۱۸۷

[2] " " ۱۷۸

الگ ہو گئے قبل اس کے کہ انکی جگہ کسی ایسے آدمی کے تقرر کا انتظام ہو جاتا
جسے تم پسند کرتے اور ریاست کے زیادہ بھاری قرضوں کی ادائیگی کا انتظام
ہوتا جن میں فوجوں کی تنخواہوں کے بقایا بھی شامل ہیں۔ چندو لال محض
تمہاری مرضی سے گئے اور مجھے اندیشہ ہے کہ نظام پر ہماری گرفت کا سب سے
بڑا ذریعہ بھی گیا۔ اب اس کا بوس سے نجات پاکر نظام ہم کو چٹکیوں میں
اڑائیں گے۔ ٹال مٹول کرینگے اور اصلاح کی راہ میں کچھ نہ کریں گے" ۔ ؎۱

کنٹجنٹ کا قرض

پہلے سندھ کی گرفت کھلنے ہی "یار وفادار" کے لئے دو سرا دام چسپت کر لیا گیا
جس میں وہ آخر پھنس کر رہا۔ گو سرکار انگریزی کو اپنے دوست کا پورا ملک تو
ہاتھ نہ آسکا تاہم یہی کیا کچھ کم ہے کہ اس کا ایک تہائی حصہ اور سب سے زیادہ
زرخیز حصہ اس کی دوستانہ دست برد سے نہ بچ سکا

کنٹجنٹ کے مصارف کا جو حال تھا وہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایسے
مالی انتشار کے زمانہ میں جبکہ ریاست کے داخل و مخارج کا توازن ہی درست نہ تھا
اس ۴۲ لاکھ سالانہ کے مستقل مطالبہ کو پورا کرتے رہنے پر ریاست کسی طرح
قادر نہ تھی۔ مہاراجہ چندو لال پہلے ولیم پامر کی کمپنی سے قرض لیکر اسکو پورا
کرتے رہے۔ پھر جب پامر کمپنی ٹوٹ گئی تو ملکی ساہوکاروں کا سہارا ڈھونڈا گیا
آخر جب ریاست کی ساکھ بالکل ہی بگڑ گئی تو اس رقم کا ادا کرنا مشکل ہو گیا اور

؎۱ میمو آئرز صفحہ ۱۹۴

تنخواہیں بقایا میں رہنے لگیں۔ جولائی ۱۸۴۳ء میں جب مہاراجہ نے استعفےٰ دیدیا تو کنٹنجنٹ کی ۶ مہینے کی تنخواہ بقایا میں تھی۔ جنرل فریزر نے رزیڈنسی کے خزانہ سے یہ روپیہ ادا کیا اور مرکزی حکومت کو اس کے متعلق لکھا وہاں سے جواب آیا کہ جتنے روپیہ کی ضرورت ہو اپنے خزانہ سے دیئے جاؤ اور نظام کو مہلت دیتے رہو۔[۵۱] اس طرح کنٹنجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جتنی بقایا نکلتی رہی اسے رزیڈنٹ چپکے چپکے اپنے خزانہ سے ادا کرتا رہا یہاں تک ستمبر ۱۸۴۶ء میں یہ نام نہاد قرض ۳۴ لاکھ کی رقم خطیر تک پہونچ گیا۔

مہاراجہ چندولال کی علیحدگی کے بعد نواب ناصر الدولہ بہادر نے دیوانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ شعبہ سیاسیات کی نگرانی (جسکا اصلاحی نام اس وقت وکالت تھا) سراج الملک (ابن منیر الملک) کے سپرد کردی تھی اور مہاراجہ چندولال کے بھتیجے راجہ رام بخش کو پیشکار مقرر کردیا تھا۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ ان بھاری قرضوں میں سے جو مہاراجہ چندولال چھوڑ گئے تھے، جون ۱۸۴۵ء تک ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ ادا ہوچکا تھا۔[۵۲] نواب کی خواہش تھی کہ بذات خود امور ریاست کی نگرانی کریں۔ مگر یہی وہ چیز تھی جسکو انگریزی حکومت نہیں چاہتی تھی۔ انگریزوں کی خواہش یہ تھی کہ نواب محل سراہیں مشغول عیش و نشاط رہیں اور حکومت کا سارا کام ایک ایسے دیوان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جو رزیڈنٹ کے زیر اثر ہو۔ انگریزی رزیڈنٹ جنرل فریزر نے اپنی تحریر میں کہا

---

۵۱ Our Faithful Ally P. 264

۵۲ میمو آئیرز صفحہ ۲۰۵

اس خواہش کا صاف صاف اظہار بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ۷ مئی ۱۸۴۴ء کے خط میں لارڈ ڈالن ہیرو کو لکھتا ہے کہ

"اس ملک کے اختیارات خود ہمارے ہاتھ میں آتے اور اس کا انتظام برطانی افسروں کے سپرد کئے جانے سے کم اگر کوئی تدبیر اصلاح میرے خیال میں آتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا وزیر مقرر کیا جائے جو برٹش گورنمنٹ کی رائے کے ساتھ (جس کا اظہار یہاں کے رزیڈنٹ کے ذریعہ ہو) حقیقی نہ کہ بناوٹی اشتراک عمل کرے۔"[۵۱]

ان ہی خیالات کی بناء پر برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بار بار زور ڈالا جا رہا تھا کہ ایک "لایق" دیوان جلد سے جلد مقرر کیا جائے۔ جب ان پیہم تقاضوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو اپریل ۱۸۴۵ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے نظام کو ایک خط لکھا جس میں ریاست کی بد انتظامی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ اگر ہمارے "دوستانہ نصائح" پر توجہ نہ کی گئی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ جون ۱۸۴۶ء میں جب ۵ سرکش زمینداروں نے غدر برپا کیا تو حکومت نظام کو کنٹیجنٹ کی خدمات دینے سے انکار کر دیا گیا۔[۵۲] اور رزیڈنٹ نے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنی شروع کیں۔ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ وہ دیوان کے تقرر کے لئے نظام پر سختی کے ساتھ زور ڈالے اور اس کے ساتھ ہی اس قرض کا بھی تقاضا کرے جو کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں ۲۸ لاکھ کی رقم تک پہونچ چکا ہے

---

۵۱ میمو آئبرز صفحہ ۲۰۲

۵۲ میمو آئبرز صفحہ ۲۰۷

اس تجویز کے مطابق ۷ ستمبر ۱۸۴۶ء کو لارڈ ہارڈنگ نے نواب ناصر الدولہ بہادر کے نام ایک خط لکھا جس میں دیوان کے تقرر اور قرض کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا تھا اس کے ساتھ ہی رزیڈنٹ کو لکھا گیا کہ نظام پر دباؤ ڈالنے کے لئے جس فوجی مظاہرہ کی ضرورت ہے وہ فی الحال ممکن نہیں ہے کیونکہ مدراس کی فوج ساگر و نربدا میں مشغول ہے۔ بمبئی کی فوج سندھ میں ہے اور بنگال کی فوج لاہور میں رکی ہوئی ہے۔[۵۱]

انگریزی حکومت کے زور دینے پر نظام ایک ایسا مدار المہام کے تقرر پر راضی ہو گئے اور انہوں نے نواب شمس الامراء و امیر کبیر کو اس منصب کیلئے منتخب کرنا چاہا۔ لیکن رزیڈنٹ سراج الملک سے پخت و پز کر چکا تھا اس نے انہی کے تقرر پر زور دیا اور اعلیٰ حضرت کی ناراضی کے باوجود یہاں تک زور دیا کہ وہ انہی کو مقرر کرنے پر مجبور ہو گئے۔[۵۲] سراج الملک سے اعلیحضرت کی ناراضی کسی ذاتی کاوش کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس بناء پر تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔ ۲ نومبر ۱۸۴۶ء کو (عین اس دن جبکہ سراج الملک مدار المہام بنائے گئے) اعلیٰ حضرت نے خود سراج الملک کی موجودگی میں جو گفتگو کی تھی اس کا مفہوم رزیڈنٹ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"برے صلاح کاروں نے سراج الملک کی طرف سے ہز ہائی نس کے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اور انہیں یہ بات سمجھائی ہے کہ میرا مقصد سراج الملک کے

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۲۰۹

۵۲ تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۳۷۰ - ۳۷۳

تقرر کی تجویز کرنے سے دراصل ان کو یہ موقع دینا ہے کہ آخر کار ملک کو برٹش گورنمنٹ کے سپرد کر دیں۔

سراج الملک کے مدار المہام ہوتے ہی مطالبہ قرض کے تمام تقاضے بند ہو گئے اور رزیڈنٹ کے مشورے سے کاروبار سلطنت انجام پانے لگے۔ فوجی معاملات کے سلسلہ میں انگریزی مفاد کی سب سے بڑی خدمت جو سراج الملک نے کی وہ یہ تھی کہ ان دیسی فوجوں کو جن کا ایک بڑا حصہ عربوں اور پٹھانوں پر مشتمل تھا جو کلیتہً نظام کے زیر اختیار تھیں اور جن پر کسی خطرے کے وقت نظام اپنی حفاظت کیلئے بھروسہ کر سکتے تھے موقوف کرنا شروع کر دیا۔ ریمو کی جمعیت کے منتشر ہونے کے بعد یہی ایسی فوج رہ گئی تھی جس پر نظام کی ساری جنگی طاقت کا انحصار تھا اور اسی فوج کا وجود انگریزی حکومت کو کھٹک رہا تھا نواب ناصر الدولہ مرحوم کے زمانہ میں اس فوج کی کل تعداد ۳۵ ہزار کے قریب تھی جن میں سے دس ہزار سپاہی خاص دار السلطنت میں موجود رہتے تھے۔ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ انہیں موقوف کیا جائے یا کم از کم ان کی تعداد نصف سے زیادہ گھٹا دی جائے حکومت نظام جب کبھی کنٹنجنٹ کے کثیر اخراجات کیلئے روپیہ بہم پہونچانے سے اپنی معذوری ظاہر کرتی تو جواب میں یہی تجویز پیش کر دی جاتی تھی کہ اس انبوہ بیکار پر جو ۳۷ لاکھ روپیہ سالانہ تم خرچ کرتے ہو اسے بند کرو اور کنٹنجنٹ کیلئے روپیہ دو۔ سراج الملک نے انگریزی حکومت کی اسی خواہش کو اپنے عہد وزارت میں پورا کرنے کی کوشش کی اور ۱۸۵۴ء میں تقریباً ۱۰ ہزار کو برطرف کر دیا خود دار السلطنت کی فوج میں سے ۶ ہزار فوج کو انگریزی رسالوں کی مدد سے زبردستی منتشر کیا گیا[۱۵]

---

[۱۳] میمو آئیرز صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۳ / ۲۶۱ و ۲۶۲   [۱۵] میمو آئیرز صفحہ ۲۱۱

اور اس طرح مرکزی حکومت میں خود اپنی فوج صرف ۴ ہزار رہ گئی حالانکہ سکندرآباد سے الوال تک جو انگریزی فوج پڑی ہوئی تھی اسکی تعداد پانچ چھ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔

سراج الملک کی اسی انگریز پرستانہ پالیسی کو دیکھکر نواب ناصر الدولہ بہادر کی ناراضی یہاں تک بڑھ گئی کہ حضور نے انکی باریابی تک بند کردی اور عیدین پر نذرانہ تک پیش کرنے کیلئے ان کو حاضری کا موقع نہ دیا۔[1] ستمبر ۱۸۴۸ء میں اعلیحضرت نے رزیڈنٹ کو بلاکر اپنی اس خواہش کا صاف اظہار کردیا کہ وہ سراج الملک کو مدار المہامی سے الگ کردینا چاہتے ہیں۔ انگریزی حکومت سراج الملک کی حمایت کا عہد کرچکی تھی اور کرنل لو نے اپنی آنکھوں سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کا وہ مراسلہ دیکھا تھا جسمیں گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سراج الملک کی قطعی تائید کیجائے[1] لیکن اس کے باوجود نواب ناصر الدولہ جیسے فرمانروا کے سامنے کھلم کھلا ان کی حمایت نہیں کیجاسکتی تھی اس لئے لارڈ ڈلہوزی نے اکتوبر ۱۸۴۸ء میں رزیڈنٹ کو لکھا کہ ہزہائی نس خود مختار ہیں جس کو چاہیں وزیر مقرر کریں لیکن انہیں صاف طور پر متنبہ کردو کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ یہ تھے۔

"گورنر جنرل ہزہائی نس کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اسی روش پر چلتے رہے تو ان کا ملک خوشحال اور پرامن نہ رہے گا اور ایسی صورت میں برٹش گورنمنٹ خود اپنے مقبوضات کے سکون اور اپنی رعیت کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے

---

[1] رشید الدین خانی صفحہ ۳۷۵ — ۷۶

[1] میمو آئیرز صفحہ ۳۵۶

ایک ہمسایہ ریاست میں شورش اور اضطراب کے وجود کو گوارا نہ کر سکے گی خصوصاً جبکہ وہ خود اس کے اپنے مفاد اور سلامتی و اطمینان کے لئے مضرت رساں ہو۔ ایسے حالات میں برٹش گورنمنٹ غالباً اپنے آپکو مجبور پائے گی کہ ہز ہائی نس کی مملکت کے اندرونی انتظام میں قطعی مداخلت کرے تاکہ اپنی رعیت تک اس مضرت اور تکلیف کو پہنچنے سے روک دے جو ایک ہمسایہ ریاست کی پراگندہ حالت سے ان پر نازل ہونی ضروری ہے"[1]

یہ تنبیہ نامہ نظام تک پہنچایا گیا مگر انہوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ جنرل فریزر نے کہا کہ ایسی حالت میں سراج الملک کی علیحدگی گورنر جنرل کی ناراضی کا باعث ہوگی۔ نواب نے جواب دیا کہ اگر گورنر جنرل ناخوش ہونگے تو بہتر ہے کہ غفراں آب اور مغفرت آب کی جگہ پر بھی سراج الملک ہی بٹھائے جائیں آخر کار سراج الملک نومبر ۱۸۴۸ء میں الگ کئے گئے اور انکی جگہ عارضی طور پر امجد الملک مدار المہام بنائے گئے۔

ادھر سراج الملک ہٹائے گئے اور ادھر قرض کا تقاضہ شروع ہو گیا۔ دسمبر ۱۸۴۸ء میں رزیڈنٹ کے نام حکم آیا کہ کنٹیجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جو قرض ہے اسکی مقدار اب بہت ہوگئی ہے نظام سے کہو کہ سود برابر ادا کرتے رہیں اور اصل رقم کی ادائیگی کا جلد انتظام کریں۔ نیز کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے ادا کرنے میں

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۲۶۶

[1] رشید الدین خانی صفحہ ۱۸۱

[2] پہلے ۱۲ فیصدی کی شرح لگائی گئی تھی۔ ۱۸۴۳ء میں اسے گھٹا کر ۶ فیصدی کر دیا گیا

اب زیادہ تساہل کو گوارا نہیں کیا جائے گا۔" آخر میں لکھا تھا کہ :-

"ہز ہائی نس صاف طور پر سمجھ لیں کہ اگر ان مطالبات کو باقاعدگی کے ساتھ پورا نہ کیا گیا تو گورنر جنرل ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرنے پر مجبور ہونگے جو ان مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی موثر ہوں جن کا اس گورنمنٹ نے ایمانداری کے ساتھ عہد کیا ہے اور خود آپ کے اپنے مفاد کے تحفظ کیلئے بھی"[1]

اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ نواب ناصر الدولہ نے امجد الملک کی جگہ نواب شمس الامراء امیر کبیر کو مدار المہام مقرر کیا۔ اور شمس الامراء نے کنٹنجنٹ کی تنخواہ ماہ بماہ ادا کرنے کا انتظام کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے رزیڈنٹ کو یقین دلایا کہ وہ قرض کا سود برابر دیتے رہیں گے اور اصل میں سے ۵ لاکھ سالانہ ادا کریں گے جس سے ۱۲ سال میں کل قرض ادا ہو جائے گا لیکن رزیڈنٹ نے اتنی مہلت دینے سے انکار کر دیا۔

شمس الامراء نے جس طریقے سے ملک کا انتظام شروع کیا تھا اس سے امید ہوتی تھی کہ وہ اس عظیم الشان خطرے سے اسکو بچا لیں گے جو قضا کے مہرم کیطرح اس کے سر پر منڈلا رہا تھا لیکن افسوس کہ دربار کی سازشوں نے اس وفادار خادم دولت کو ۵ مہینے بھی چین سے نہ ٹکنے دیا اور آخر کار مئی ۱۸۴۹ء میں اسے استعفیٰ دینا پڑا۔

جون ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ ایک خوشگوار صبح کو نظام اپنے نتائج اعمال کے ہاتھوں جھنجھوڑ کر جگائے جائینگے"۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا کہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ نظام خود اپنے ہاتھوں اپنا سر پھوڑنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن اگر

---

[1] میمو آئرز صفحہ ۲۹۰

انہوں نے ایسا کرنے کا فیصلہ ہی کرلیا ہے تو میں اس کا انتظام کرلوں گا کہ اس گورنمنٹ کے مفاد کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔ اودھ میں انکی شاہی برادری کا ایک دوسرا بھائی اسی روش پر چل رہا ہے، جو نہی کہ لارڈ ہارڈنگ کی دی ہوئی دو سالہ مہلت ختم ہوگی میں کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ مختصر یہ ہے کہ میرے ہاتھ کچھ عرصہ کے لئے ان مور کھ رئیسوں سے بھرے رہتے نظر آرہے ہیں۔[51]

ان دھمکیوں میں جو معنے پوشیدہ تھے وہ کچھ زیادہ عرصہ تک چھپے نہ رہے شمس الامراء کی علیحدگی کے بعد کنٹیجنٹ کی تنخواہیں پھر بقایا میں رہنے لگیں۔ اعلیحضرت نے راجہ رام بخش کو دوبارہ پیشکار مقرر کیا مگر انتظام کے لئے ان سے زیادہ قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ آخر ستمبر ۱۸۴۹ء میں نظام کو نوٹس دیدیا گیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۰ء تک تمام قرض ادا کردیا جائے ورنہ برٹش گورنمنٹ جو مناسب سمجھے گی کرے گی۔ لارڈ ڈلہوزی نے صاف کہدیا کہ بحیثیت قرض خواہ اس گورنمنٹ کو نظام پر رحم کھانے کی وجہ نہیں ہے اب وہ انکو ڈھیل نہیں دیگی۔[52]

قرض کے بدلے ملک کا مطالبہ

ڈلہوزی خود جانتا تھا کہ ۱۵ مہینہ کی مدت میں نظام کے لئے ۷۰ لاکھ روپیہ کی رقم معہ سود ادا کرنا مشکل ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ ہی کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں

---

[51] میمو آئیرز صفحہ ۲۹۱ و ۲۹۲

[52] میمو آئیرز صفحہ ۲۹۹

۳ لاکھ ۳۵ ہزار روپیہ مہینہ کا مستقل خرچ بھی ان کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے اس نے نوٹس دینے کے بعد ہی نومبر ۱۸۴۹ء میں رزیڈنٹ کو لکھا کہ اب میں نے ایک آخری کارروائی کرنے کا عزم کرلیا ہے لہٰذا تم خفیہ طور سے اپنی رائے بتاؤ کہ قرض کے عوض کفالت میں نظام کے ملک کا کونسا حصہ مانگنا زیادہ مناسب ہوگا۔[۵۱] اس کے جواب میں جنرل فریزر نے ۱۹ر دسمبر ۱۸۴۹ء کو ڈلہوزی کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے بعض حصے قابل مطالعہ ہیں۔

"برار پائین گھاٹ تجارتی اور زرعی دونوں حیثیات سے نظام کی مملکت کا سب سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش حصہ ہے اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس کی مالگزاری کے وصول کرنے میں کوئی دقت پیش آئی ہو میں یقین رکھتا ہوں کہ روئی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی خطہ اس پر فوقیت نہیں رکھتا اور اس چیز کی پیداوار اور برآمد ہمارے انتظام میں اس سے بدرجہا زیادہ ہو جائے گی جتنی اب تک رہی ہے۔"

آگے چل کر فریزر کہتا ہے کہ اس علاقہ کی آمدنی کے متعلق زیادہ تحقیق کرنا مشکل ہے کیونکہ کھود کھود کر پوچھنے سے شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے پھر لکھتا ہے:

"اگر کل آمدنی صرف ۳۵ لاکھ ہوئی جیسا کہ یہاں فرض کیا جا رہا ہے تو اس کمی کو قریب کا مزید علاقہ لیکر پورا کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرنا ضروری ہی ہوگا جبکہ ہم کنٹنجنٹ کے مصارف کے ساتھ آپا دیسائی کی چوتھ اور بھیت راؤ کے خاندان کے سالیانہ کو بھی شامل کرلیں جس کی مجموعی مقدار ۱۲۶۰۰۰

---

[۵۱] بیمو آئیرز صفحہ ۳۰۲

تک پہونچتی ہے۔ نیز ۳۲۴۰۰۰ سالانہ کے سود کو بھی شامل کرلیں جو نظام
کے قرض پر عائد ہوگا۔ اس طرح کنٹیجنٹ کا خسارہ اور یہ رقمیں ملکر تقریباً
سات آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ہو جائیں گی اور اس کے لئے مناسب ہوگا کہ
ضلع دولت آباد کا ایک حصہ بھی لے لیا جائے۔ اگر نظام اس پر اعتراض
کریں کیونکہ غالباً وہ اپنی مملکت کے اس حصہ کو ہمارے انتظام میں دینا
پسند نہ کریں گے جس میں اورنگ آباد اور دولت آباد واقع ہیں تو ہم ناندیڑ
اور رکلم کے اضلاع کا بالائی حصہ طلب کرسکتے ہیں کہ وہ بھی کمی کو پورا
کرنے کے لئے کافی ہوگا۔[۵۱]

۱۸۰۵ء کا ابتدائی زمانہ خاموشی کے ساتھ گذرا کیونکہ سال کے آخر تک کی
مہلت دیجا چکی تھی۔ نظام ادائے قرض کے انتظام کے لئے برابر جد و جہد میں مشغول
تھے لیکن جب سال ختم ہونے کے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ مدت مقررہ کے اندر
قرض ادا نہ کرسکیں گے۔ راجہ رام بخش پیشکار انکی توقعات کو پورا نہ کرسکے قرض کی
مقدار ۱۴۶ لاکھ تک پہنچ گئی اور خزانہ میں کچھ مہیا نہ ہوسکا۔ آخر ۷ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو
اعلیحضرت نے انہیں الگ کردیا اور رزیڈنٹ کو بلاکر کہا کہ "راجہ رام بخش نے مجھ سے
قطعی وعدہ کیا تھا کہ ۶۰ لاکھ روپیہ مہیا کردینگے مگر ان کا وعدہ غلط نکلا اب مجھے
مزید مہلت دو میں پچاس دن میں ۳۰ لاکھ روپیہ دیدونگا اور اسکے بعد دو سال کے
اندر پوری رقم ادا کردونگا" لیکن رزیڈنٹ نے مہلت دینے سے انکار کیا اور نہ اقرار[۵۲]

---

[۵۱] میمو آئیرز صفحہ ۲۰۵ و ۲۰۶
[۵۲] ״ ״ ۳۱۴

۱۶ دسمبر کو اعلحضرت نے سراج الملک کے ہاتھ پھر پیام بھیجا کہ ہم ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کے حساب سے قرض ادا کر دیں گے لیکن رزیڈنٹ نے صاف جواب دیا کہ مجھے امید نہیں کہ گورنر جنرل اپنے فیصلہ کو بدل دیں گے۔ ۲۲ دسمبر کو اعلحضرت نے خود جنرل فریزر کو بلا کر فرمایا کہ میرے پاس اب بھی سوا کروڑ روپیہ کے جواہر موجود ہیں تم برٹش گورنمنٹ کو اطمینان دلا دو کہ اس کا قرض ڈوبے گا نہیں۔ لیکن رزیڈنٹ کا وہی ایک جواب تھا کہ میں آپ کے ارشادات گورنر جنرل تک پہنچا دونگا مگر مجھے امید نہیں کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدلیں گے۔ اسطرح مدت معینہ گذر گئی اور قرض ادا نہ ہو سکا اس وقت قرض کی تعداد ۷۰ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔

اس زمانہ میں برار کو جسے ارض موعود سمجھا جا رہا تھا انگریزی تسلط کیلئے تیار کرنے کی تدبیریں شروع کر دی گئیں انگریزی علاقہ سے روہیلوں کی ایک تعداد کثیر اس علاقہ میں گھس آئی اور اس نے وہاں شورش و بدامنی کا سلسلہ شروع کر دیا اور وہاں کے پرامن باشندے انکی شرارتوں سے بھاگ بھاگ کر انگریزی علاقہ میں پناہ لینے لگے۔ یہ ملک گیری کیلئے جواز کا پہلو نکالنے کی پرانی تدبیر ہے جو مملکت برطانیہ کی توسیع کیلئے بارہا استعمال کی جا چکی ہے اسکے ساتھ ہی رزیڈنٹ نے جنوری ۱۸۵۱ء میں ملک برار کا پورا نقشہ مع متعلقہ وار آمدنی کے بنا کر گورنر جنرل کو بھیجا اور لکھا کہ میری رائے میں برار پائین گھاٹ اور برار بالا گھاٹ ہمارے مقاصد کیلئے بہترین اضلاع ہونگے مگر انکے ساتھ ہمیں سرکار دولت آباد کو بھی شامل کر لینا چاہئے یہی نہیں بلکہ اسی زمانہ میں جنرل فریزر نے ان افسروں کو بھی نامزد کر دیا جنکے سپرد وہ برار کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔

میمو آئیرز صفحہ ۳۲۶ ۵۲ میمو آئیرز صفحہ ۳۲۳ ۵۱

اس وقت نظام کے لئے مالی مشکلات سے زیادہ پریشان کن یہ چیز تھی کہ وزارت کیلئے کوئی ایسا وفادار آدمی نہ ملتا تھا جو رزیڈنٹ کے اثر سے آزاد رہکر ایمانداری کے ساتھ ان کی خدمت کر سکے۔ فروری ۱۸۵۱ء میں انہوں نے غور و خوض کے بعد گنیش راؤ کو پیشکار بنایا جس کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ رزیڈنٹ کے بجائے خود اعلیحضرت کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن سکتا تھا لیکن اسکی ناقابلیت نے رزیڈنٹ کو مخالفت کا اچھا بہانہ دیدیا اور اس نے گنیش راؤ کے ساتھ سرکاری تعلق رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی اصلی شکایت یہ تھی کہ نظام نے ایسے شخص کو پیشکار بنایا ہے جو ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا ہے۔ حالانکہ اس کو رزیڈنٹ کے ہاتھ میں ناچنا چاہیے فریزر کی رائے میں بہتر تو یہ تھا کہ سارا ملک انگریزی انتظام میں لے لیا جاتا لیکن

لہ یہاں اس امر کی تصریح ضروری ہے کہ فریزر ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۲ء کے وسط تک برابر اس بات پر زور دیتا رہا کہ پوری ریاست انگریزی انتظام میں لی جائے لیکن لارڈ الن برو، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ ڈلہوزی تینوں گورنر جنرلوں کو اپنے اپنے عہد حکومت میں اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ اس پر عمل کرتے الن برو کے زمانہ میں جب یہ سفارش کیگئی تو اس نے اپنے ۲۷ فروری ۱۸۴۴ء کے خط میں صاف طور پر لکھدیا کہ "آج کل سندھ اور ستلج میں فوج کی زیادہ ضرورت ہے میں جانتا ہوں کہ ہمیں حیدرآباد میں بھی بہت کچھ کرنا ہے مگر میں ایک وقت میں دو کام نہیں کر سکتا جب اس کا وقت آئیگا تو اس کے معاملات کو بھی سلجھایا جائیگا (میمو آئیرز صفحہ ۲۰۲) لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں جب فریزر نے پھر اس مسئلہ کو چھیڑا تو اس نے معذرت کی کہ مدراس بنگال اور بمبئی کی فوجیں ساگر نربدا، لاہور، سندھ میں پھنسی ہوئی ہیں اس لئے کچھ نہیں کیا جا سکتا (میمو آئیرز صفحہ ۲۰۹) پھر لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اس نے متعدد مرتبہ اس تجویز کو پیش کیا ڈلہوزی نے منافقانہ انداز میں جواب دیدیا کہ ہمارا ایسا کرنا بدعہدی و پیمان شکنی کا مترادف ہوگا مگر واقعہ

٦٣٧٦

اگر ایسا نہ ہو سکے تو۔

"اس کا واحد بدل، اگرچہ بہت ناکافی ہی سہی صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دیوان اس صریح مفاہمت کے ساتھ مقرر کیا جائے کہ اگرچہ وہ آخر میں تو اپنے بادشاہ اور ملک کے سامنے جوابدہ ہوگا لیکن حکمرانی میں اسکے اختیارات مطلق ہوں گے اور اسے رزیڈنٹ کی موافقت سے کام کرنا ہوگا۔"[۵۱]

ایک دوسری تحریر میں فریزر نے حیدرآباد کی مدارالمہامی کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے۔

"اس ملک کے انتظام میں کوئی ایسا شخص اچھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا جو ملک کے باشندوں کا اعتماد نہ رکھتا ہو اور اس سے بھی زیادہ ضروری صفت کی حیثیت سے، جس کو برٹش گورنمنٹ کا اعتماد نہ حاصل ہو۔"[۵۲]

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۲۱

۵۲ میمو آئیرز صفحہ ۳۲۳

(بقیہ حاشیہ ص۷۷) یہ ہو کہ پنجاب و صوبہ سرحد کی زبردست فوجی مشکلات نے اسکو اتنی مہلت نہیں دی کہ حیدرآباد کی پوری ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں وہ خود لکھتا ہے کہ "خواہ واقعات کچھ بھی پیش آئیں جب تک پنجاب میں جنگ ختم نہ ہو جائے اور ملک کے اس حصہ کے معاملات طے نہ ہو جائیں حکومت ہند نہ تو حیدرآباد کی سلطنت میں کسی قسم کی بڑی اصلاحات کا بار اٹھا سکتی ہے اور نہ کسی بڑے سیاسی انقلاب کا انتظام کر سکتی ہے اگر نظام اپنے مصائب کو بڑھانا پسند کرتے ہیں تو وہ خود اپنے راستہ پر چلتے رہیں گورنمنٹ آف انڈیا کو ابھی انکی خبر لینے کی فرصت نہیں ہے البتہ اگر وہ فی الواقع لڑنا ہی چاہیں تو ایسی صورت میں بیشک ہم ان سے نپٹ لیں گے (میمو آئیرز ص۲۶۸)

رزیڈنٹ اور نظام کے درمیان یہی کشمکش جاری تھی کہ ۶ ؍جولائی ۱۸۵۱ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کی جانب سے ایک طویل مراسلہ جنرل فریزر کو موصول ہوا جس میں پرار پائین گھاٹ اور دوآبہ رائچور کے متعلق اس کی تجاویز پر اظہار پسندیدگی کیا گیا تھا اور گورنر جنرل کی طرف سے اسکو ہدایت کی گئی تھی کہ نظام سے اس ملک کی تفویض کا مطالبہ کرے۔ آگے چل کر اس خط میں لکھا تھا کہ

"اگر نظام تمہاری مقرر کی ہوئی مدت کے اندر گورنمنٹ کے مطالبات کو پورا نہ کریں تو تم ان سے ایک قطعی جواب لینے کے لئے آخری ملاقات کی درخواست کرنا۔ اگر ہز ہائی نس اس موقع پر بھی راضی نہ ہوں یا ایسے انتظامات کرنے سے قاصر رہیں جو مطلوب ہیں تو اس سے تم گورنر جنرل کو مطلع کرنا۔" اس قسم کی اطلاع ملنے پر تمہیں اس امر کے متعلق ہدایات بھیجدی جائینگی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے مبینہ اغراض کے لئے مذکورہ اضلاع پر قبضہ کرلو ان ہدایات کے ملنے کی امید پر تم لکھو کہ آیا تمہیں سب سیڈیری فوج اور کنٹیجنٹ کے علاوہ کچھ اور فوج بھی اس فیصلہ کی تعمیل کیلئے درکار ہوگی"

اس کے ساتھ ہی فریزر کو لارڈ ڈلہوزی کا ایک خریطہ بھی ملا جو اعلیحضرت کے نام لکھا گیا تھا۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ میں اس کا مخاطب ایک پرانا اور گہرا دوست تھا جس کے ساتھ پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے برٹش گورنمنٹ کے "دوستانہ تعلقات" تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس خط میں اسی "یار وفادار" کو اس برٹش گورنمنٹ کے غضب سے ڈرایا گیا تھا جسکی طاقت کا چال

تھا کہ

"ہر گاہ خواہد آں عالی شان را پامال ساختہ بے نام و نشان سازد"

ان خشمناک دھمکیوں کے ساتھ دو امور کا مطالبہ کیا گیا تھا ایک یہ کہ کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں جو قرض ۷۵ لاکھ تک پہنچ چکا ہے اسے ادا کرو۔ دوسرے یہ کہ کنٹیجنٹ کا قرض باقاعدگی کے ساتھ دو جس کے تم از روئے معاہدہ پابند ہو[۱] ان دونوں اغراض کیلئے نظام پر زور دیا گیا تھا کہ وہ اپنی عرب اور دوسری بیقاعدہ فوج کو برطرف کر دیں تا کہ کنٹیجنٹ کی پرورش کیلئے کافی رقم بچ سکے[۲]۔

اس خریطہ نے دربار میں ایک کھلبلی مچا دی۔ نواب ناصر الدولہ کو ایک طرف گورنر جنرل کی درشت کلامی سے انتہائی رنج پہونچا اور دوسری طرف ریاست کے مستقبل کے متعلق سخت تشویش لاحق ہوئی۔ آخر اس بلا کو ٹالنے کے لئے انہوں نے جون ۱۸۵۱ء کے آخر میں سراج الملک کو از سر نو دیوان بنایا اور ادائے قرض کیلئے شدید جد و جہد شروع کر دی جو کچھ خزانہ سے مہیا ہو سکا وہ بہت کم تھا۔ کمی کو پورا کرنے کے لئے نواب نے خود اپنے پاس سے ایک جھنبیہ۔ ایک سرپیچ ایک کنٹھی۔ ایک ہار۔ ایک طرہ۔ ایک جوڑ دستبند۔ اور ایک پارہ الماس نا تراشیدہ دیکر اُسے رہن رکھا۔ کچھ ریاست کے امرا سے روپیہ لیا اور اس طرح ۱۵ اگسٹ ۱۸۵۱ء کو ۵۸۴۵۴۰۸۳ کلدار رزیڈنٹ کے حوالے کئے اب صرف

۱۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے خود بارہا اعتراف کیا تھا کہ نظام پر از روئے معاہدہ کنٹیجنٹ رکھنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۲۔ Hyderabad affairs Vol. 11. P. 522, 528.

۳۲۹۷۷۰۲ روپے باقی رہ گئے تھے جس کے لئے نظام نے ۳۱ر اکتوبر تک کی مہلت لی۔ لیکن اس مدت میں اتنی رقم کا انتظام نہ ہو سکا اور دسمبر میں صرف ۸۷۳۵۴۷ روپے ادا کئے جا سکے۔

۱۸۵۲ء کا آغاز اس طرح ہوا کہ نظام ادائے قرض کے لئے جان توڑ جد و جہد کر رہے تھے اور انگریزی حکومت قرض کے بدلے میں ملک لینے کی تدبیروں میں منہمک تھی۔ اب انگریزی حکومت کی طرف سے قرض کا تقاضہ بہت سست ہو گیا تھا بلکہ اپریل ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو لکھ دیا تھا کہ :-

کنٹنجنٹ کی تنخواہیں باقاعدہ ادا کرنے کا ضرور انتظام کرو مگر اس وقت کمپنی کے اصل قرضہ کی ادائیگی پر زور دینے سے احتراز کرو۔[۵۱]

ڈلہوزی کی خواہش یہ تھی کہ نظام کو کافی عرصہ تک قرض کی طرف سے غافل رکھا جائے اور جب قرض اس حد تک پہونچ جائے کہ ادا کرنا ان کے لئے مشکل ہو تو فوراً ملک کی تفویض کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء کے اواسط میں اسی پالیسی کے مطابق ملک ہضم کرنے کے نقشے بنتے رہے۔ ڈلہوزی کو پورا احساس تھا کہ موجودہ الوقت معاہدات سے برٹش گورنمنٹ کو کنٹنجنٹ رکھنے اور اس کا خرچ نظام سے لینے کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے وہ چاہتا تھا کہ نظام سے ایک جدید معاہدہ کیا جائے جس کی رو سے کنٹنجنٹ کو جواز کا جامہ پہنا دیا جائے اور اگر نظام اس پر راضی نہ ہوں تو ان سے زبردستی دستخط حاصل کئے جائیں۔ ۱۲ اپریل ۱۸۵۳ء کو اس نے فریزر کے نام جو خط بھیجا تھا اس کا یہ بیان کرنے کے بعد

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۷۴

ازروئے معاہدہ کنٹنجنٹ کا وجود جائز نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

"میرے بیان کردہ وجوہ کی بنا پر ہم کو قطعی طور پر یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ کنٹنجنٹ کو ایک ایسے معاہدہ کے ذریعہ واضح اور محفوظ بنیاد پر قائم کر دیا جائے جو خاص اسی مقصد کے لئے سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کے ضمیمہ کی حیثیت سے طے کیا جائے، کنٹنجنٹ کی مقدار اور اس کے فرائض وغیرہ بصراحت متعین کر دیئے جائیں اور اس کے مصارف کے لئے ایک حصہ ملک برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا جائے۔ یہ علاقہ محض تفویض کیا جائے گا۔ اس کے شاہی حقوق منتقل نہیں کئے جائیں گے اور یہ تفویض اسی بنیاد پر ہوگی جس پر سندھیا نے سنہ ۱۸۴۳ء میں گوالیار کا ایک علاقہ کنٹنجنٹ کے لئے تفویض کیا ہے وہ خاص علاقہ جو اس طرح تفویض کیا جائے گا وہی ہوگا جس کو حکومت ہند اس وقت تک اپنے تصرف میں رکھنے کی خواہش ظاہر کر چکی ہے جب تک کہ وہ قرضہ جو اس کے حق میں واجب الادا ہے پورا کا پورا باز یافت نہ ہو جائے حکومت کے حقوق استعمال کرنے کی قوت لامحالہ ہم کو ان اضلاع میں حاصل ہونی چاہیئے جو نظام ہمارے سپرد کریں گے۔"

"اس تفویض کردہ علاقہ کی آمدنی انتظام کے اخراجات وضع کرنے کے بعد اس طرح صرف کی جائے گی (۱) کنٹنجنٹ کے مصارف میں (۲) مذکورہ بالا قرض کے سود میں (۳) چھوٹی چھوٹی مدات میں (۴) باقی بچت اگر ہوئی تو وہ نظام کو ادا کر دی جائے گی۔ اور انکی اطلاع وطمانیت کے لئے مفوضہ علاقہ کے حسابات سال کے سال حکومت ہند کی طرف سے پیش کئے جائیں گے۔

اگر نظام اتنے غیر معقول ثابت ہوں کہ وہ ان تجاویز کو جو انہی کے مفاد کیلئے پیش کی جارہی ہیں رد کر دیں تو یہ مسئلہ اتنا نازک ہو جائے گا کہ ابھی تک اتنا نازک نہیں ہوا ہے۔ سر دست میں اپنے آپ پر کسی ایسے طریق عمل کے اظہار و اعلان کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا جسے حکومت ہند، اس صورت میں اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ نظام کی جانب سے کنٹنجنٹ کی نامنظوری کو گورنمنٹ منظور کرلے گی (خواہ وہ ایک ایسے رئیس کے طرز عمل کے متعلق کیسی ہی رائے رکھتی ہو جس کا رویہ اتنا غیر دیانتدارانہ ہوگا) تب بھی اس وقت اور آئندہ بھی کچھ عرصہ کیلئے کنٹنجنٹ کو رکھنا پڑے گا ..... نظام کو ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس فوج کو کلیتہً برطرف کر دیں اور اس کے سپاہیوں کو ملک پر بے مہار چھوڑ دیں ......
پس اگر نظام کنٹنجنٹ کے بحال رکھنے کو نامنظور کریں تب بھی اس دوران میں کہ اس کو انجام کار فنا کرنے کی نیت سے رفتہ رفتہ گھٹایا جارہا ہو۔ اس کے مصارف کا بندوبست ہونا چاہیئے اس غرض کیلئے بھی ملک کی تفویض اتنی ہی ضروری ناگزیر ہے جتنی دوسری صورت میں ہو سکتی ہے نظام کو ملک دینے پر راضی ہونا چاہیئے۔ اگر وہ انکار کریں گے تو برٹش گورنمنٹ حق و انصاف پر ایسی دست برد کو ہرگز گوارا نہ کرے گی اور بیان کردہ اغراض کیلئے ان علاقوں پر عارضی قبضہ زبردستی حاصل کرلے گی۔"[۵۱]

اس خط کے جواب میں جنرل فریزر نے اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے

---

۵۱ میمو آئیرز صفحہ ۳۷۷ ۳۷۹

لارڈ ڈلہوزی کو بتایا کہ اس کی تجاویز نظام کے حق میں کیسی ہیں اس نے لکھا کہ
"جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس مجوزہ انتظام کا درست اور حق بجانب ہونا
ناقابل انکار ہے مگر جہاں تک نظام کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس تجویز
میں ان کی یقینی بربادی اور ایک خودمختار بادشاہ کی حیثیت سے انکے
اقتدار کی کامل موت ہے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ نظام کو اگر بُرے سے
بُرے حالات میں بھی مبتلا کر دیا جائے۔ تب بھی وہ برٹش گورنمنٹ کے
قطعی مطالبات یا احکام کی تعمیل میں کوئی مزاحمت کر سکیں گے مگر میں سمجھتا ہوں
ہم کو ان سے اس خاموش مقابلہ کی ضرور توقع کرنی چاہئے جو اس شکل میں ہوگا
کہ وہ مطلوبہ اضلاع کو ہمیں باقاعدہ تفویض کرنے سے انکار کر دیں گے اور اگر ہم
ان اضلاع پر قبضہ کر لینا ہی پسند کریں تو وہ ہم کو جو ہمارا جی چاہے
کر لینے دیں گے"[۱]

ایک طرف "یار وفادار" کو "برباد" کرنے اور اس کے ملک پر "زبردستی"
قبضہ کرنے کے لئے یہ منصوبے ہو رہے تھے اور دوسری طرف خود "یار وفادار"
اپنی عزت اور سلطنت کے بچانے کے لئے آخری جد و جہد کر رہا تھا۔ سنہ ۱۸۵۲ء
کے آخری زمانہ میں حیدرآباد کے بڑے بڑے ساہوکاروں کی ایک انجمن مسٹر
ڈائیٹن ——————— کے زیر صدارت قائم
کی گئی تاکہ متحدہ سرمایہ سے ایک سرکاری بنک کھولے اور حکومت کی مالی
حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔

---

[۱] میمو آئیرز صفحہ ۳۸۳ و ۳۸۴

نواب ناصر الدولہ بہادر نے اس جماعت سے ۴ لاکھ روپیہ قرض لینے کا
بندوبست کیا اور کفالت میں نہایت قیمتی جواہر پیش کئے جنہیں مسٹر داسٹن کی
حفاظت میں دیدیا گیا۔ اس انتظام کے بعد سراج الملک نے رزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ
عنقریب کمپنی کا قرض ادا کر دیا جائے گا اور رزیڈنٹ نے اسکی اطلاع لارڈ ڈلہوزی
کو دیدی۔ اگر لارڈ ڈلہوزی ایک "ایماندار پبلک مین" ہوتا جیسا کہ اس کا دعویٰ تھا
تو اسے اس اطلاع کو اطمینان کی نظر سے دیکھنا چاہئے تھا لیکن اس کے برعکس یہ خبر
سنتے ہی وہ پریشان ہوگیا اور اس نے فوراً رزیڈنٹ کو لکھا کہ برطانی رعایا
کے کسی فرد کی جانب سے کسی دیسی والیٔ ریاست کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے
کورٹ آف ڈائرکٹرز یا گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی گورنر باجلاس کونسل
کی اجازت کے بغیر روپیہ قرض دیا جانا پارلیمنٹ ایکٹ (۳۷)
George 111 Ch. 142 Sec. 28. کے خلاف ہوگا۔" اس کے ساتھ
ہی ڈلہوزی نے رزیڈنٹ کو حکم دیا کہ بلا تاخیر اس کو اطلاع دے کہ یہ بنک
کن لوگوں نے کھولا ہے اور کون اس کو چلا رہا ہے؟ اگر ان میں سے کوئی
ایک بھی یورپین ہو تو حیدرآباد کی حکومت کو معاہدہ ۱۷۹۸ء کی دفعہ ۶ کے
ماتحت اس سے کوئی کام لینے یا اس کو اپنے حدود مملکت میں رہنے کی
اجازت دینے سے روک دیا جائے۔[۱]

اس حرکت کے معنی بیان کرنا اسکی وضاحت کی توہین کرنا ہے اس میں
انگریزی قوم کے سیاسی اخلاق کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ اتنی روشن

---

[۱] میمو آئیرز صفحہ ۳۸۹ و ۳۹۰

ہو کہ شرح بیان کی محتاج نہیں۔ لارڈ ڈلہوزی برار لینے کا عزم کر چکا تھا قرض وصول ہوتے یا نہ ہوتے کنٹنجنٹ کے قائم رہنے یا نہ رہنے کی اس کو پرواہ نہ تھی۔ اسے بہر حال برار لینا تھا اس لئے جو کوئی اس کی اس خواہش میں مزاحم ہوتا ہی اسے قدرتی طور پر ایسا ہی مجرم ہونا چاہئے تھا کہ حیدرآباد میں کاروبار کرنا کیا معنی نظام کے ممالک محروسہ میں بھی اس کے خطرناک وجود کو نہ رہنے دیا جاتا۔ چنانچہ مسٹر ڈائیٹن کو بہت جلدی حیدرآباد سے نکال دیا گیا۔ اور چونکہ وہ بھی لارڈ ڈلہوزی کے ہم قوم تھے اس لئے ان کا بھی کم از کم اتنا فرض ضرور تھا کہ چلتے چلتے وہ جواہرات بھی لے جاتے جو مجوزہ قرض کی کفالت میں حضور نظام نے دیئے تھے ان جواہرات کو بعد میں سر سالار جنگ مرحوم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا جبکہ قریب تھا کہ وہ ہالینڈ میں بیچ دیئے جاتے۔[1]

اس طرح جب روپیہ حاصل کرنے کی تمام تدبیروں میں ناکامی ہوئی اور شاہی خزانے کے بیش قیمت جواہر کا ایک بڑا حصہ قبضہ سے نکل گیا تو نظام بالکل بے بس ہو گئے۔ ان کی سلطنت کی مالی حالت اس وقت حد سے زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ وسائل ثروت تقریباً سب کے سب ۵۰ سال کی مسلسل بدنظمی اور فضول خرچی کی نذر ہو چکے تھے۔ آمد و خرچ کے عدم توازن کا یہ حال تھا کہ ۲۷ لاکھ روپیہ کا سالانہ پیہم گھاٹا آرہا تھا۔ صرف فوج کا خرچ ایک کروڑ سالانہ سے زائد تھا حالانکہ ریاست کی کل آمدنی نظم و نسق کے مصارف کو وضع کر کے صرف ایک کروڑ ۲۲ لاکھ تھی ایسی حالت میں ریاست کے خزانہ سے

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۳۹۲

۵۰ لاکھ ادا کرنا اور پھر ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ بھی ادا کرتے رہنا ناممکن تھا۔ اب دوسری صورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ اس خاندانی دولت کو نکالا جاتا جو نظام کے بزرگوں نے ڈیڑھ صدی کے اندر جمع کی تھی سوانگریز دوستوں کی بدولت اس خاندانی دولت کا بھی ایک معتدبہ حصہ ہاتھ سے نکل گیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے موقع بھی چھن گئے۔ یہی بے بسی کی حالت تھی جس میں نظام کو تفویض برار کے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا جو کرنل ڈیوڈسن اسسٹنٹ رزیڈنٹ کے الفاظ میں دھمکیوں اور بھبکیوں کا نتیجہ تھا۔

قرض کی اصلیت

تفویض برار کا معاہدہ جس طرح ہوا اسکی کیفیت بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ قرض جس کی خاطر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس کی اصلیت کیا تھی اور قانوناً، عرفاً، اخلاقاً وہ کہاں تک نظام کے ذمہ واجب الادا ہوسکتا تھا اس کے لئے ذیل کے امور خاص طور پر قابل غور ہیں۔

(۱) کنٹنجنٹ قائم کرنے کے لئے نظام کی باضابطہ منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی اور محض پیشکار سے معاملہ طے کرکے اس کو نظام کے سر چپکا دیا گیا تھا یہ فعل نہ صرف قانوناً ناجائز تھا بلکہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۵ کے بھی خلاف تھا جسمیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہز ہائی نس کی اولاد عزیز و اقارب رعایا اور ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی۔[۵۱] اس معاہدہ کی رو سے

[۵۱] Aitchison. Vol. IX P. 72.

کمپنی کی حکومت کو کوئی حق نہ تھا کہ نظام کی اجازت کے بغیر بالا بالا پیشکار سے ایک ایسا معاملہ طے کر لیتی جس سے سلطنت کے خزانہ پر ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا ناقابل برداشت بار پڑتا تھا۔

(۲) کنٹینجنٹ باوجودیکہ نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی مگر اس کے انتظام میں نظام کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہ تھی خود کمپنی کے ذمہ دار افسروں نے حتی کہ خود گورنر جنرل نے تسلیم کیا کہ کنٹینجنٹ کے مصارف حد سے زیادہ ہیں لیکن جب تک اس کا خرچ نظام کے خزانہ سے وصول ہوتا رہا اس وقت تک اس میں ایک پیسہ کی کمی نہیں کی گئی۔ اگر کمپنی تفویض برار کے معاہدہ سے صرف ۴ سال پہلے ہی کنٹینجنٹ کے مصارف میں اتنی تخفیف کر دیتی جتنی کہ معاہدہ کے بعد چار سال کے اندر اس نے کی تو ۱۸۵۳ء میں نظام کے ذمہ کمپنی کا ایک پیسہ قرض نہ ہوتا بلکہ نظام کے خزانہ میں الٹے دس لاکھ روپیہ بچ رہتے۔

(۳) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۲ کی رو سے نظام نے صرف یہ عہد کیا تھا کہ کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں وہ ۱۵ ہزار سپاہیوں سے انگریزی حکومت کی مدد کریں گے اس کا ہرگز منشا نہ تھا کہ وہ اپنے خرچ سے انگریزوں کی مدد کے لئے خود انگریزوں کی نگرانی میں ۹ ہزار فوج ہمیشہ رکھیں گے خواہ جنگ ہو یا نہ ہو۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے اقرار کے مطابق ۳۵ سال تک انگریزی حکومت کو ایسی کوئی جنگی ضرورت پیش نہیں آئی جس کے لئے نظام سے مدد طلب کی جاتی[1]۔ پس اس لحاظ سے نظام کو خواہ مخواہ ۳۵ سال تک ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ

[1] میمو آئیرز صفحہ ۴۲۵

(یعنی کل ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ) ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ معاہدہ کی رو سے ان پر یہ روپیہ دینے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

(۴) سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام نے ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا ملک (جو میسور کی دو لڑائیوں میں ان کے ہاتھ آیا تھا) کمپنی کو اس غرض سے دیا تھا کہ وہ ان کی امداد کے لئے فوج رکھے جس کا خرچ اس وقت ۴۲ لاکھ سالانہ تھا اس امدادی فوج کا از روئے معاہدہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ

"اگر مستقبل میں شورا پور یا گدوال کے زمیندار یا ہز ہائی نس کی حکومت کے دوسرے وابستگان توابع (Subjects or Dependants) سرکار کے جائز مطالبات کو جو ان پر ہوں ادا نہ کریں یا بغاوت کی آگ بھڑکائیں یا شورش پھیلائیں تو جمعیت تغلبندی (سب سیڈیری فورس) یا اس کا اتنا حصہ جو ضروری ہو جرم کی حقیقت پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد ہز ہائی نس کی اپنی افواج کی معیت میں ایسے تمام مجرموں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے جانے پر تیار ہوگی۔"

اس دفعہ کی رو سے سرکار نظام اس امر کا پورا حق رکھتی تھی کہ اسکی رعایا میں سے جب کبھی کوئی سرکشی کرے تو وہ جمعیت تغلبندی کی خدمات کمپنی سے حاصل کرے لیکن کمپنی چونکہ اس فوج کا خرچ مع شے زائد نظام سے وصول کر چکی تھی اس لئے اس نے شورشتوں اور سرکشیوں کو فرو کرنے کے لئے اس کی خدمات دینے سے ہمیشہ انکار کیا اور ان ہی فرائض کو جو

جمعیت تغلبندی پر از روئے معاہدہ عاید ہوتے تھے کنٹجنٹ پر ڈالدیا کیوں کہ اس کے مصارف کا بار خود نظام کے خزانہ پر پڑتا تھا۔ ۳۵ سال کی مدت میں حیدر آباد کنٹجنٹ نے نظام سرکار کی جتنی خدمات انجام دیں وہ سب کی سب ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے خود کمپنی کی جمعیت تغلبندی کو انجام دینی چاہیئے تھیں۔ اس لئے حکومت نظام سے ان کا معاوضہ وصول کرنا جبکہ معاوضہ پہلے ہی ۶۳ لاکھ کے ملک کی صورت میں دیا جا چکا تھا سراسر ناجائز تھا۔

(۵) جمعیت تغلبندی کے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے خود نظام کے خرچ پر کنٹجنٹ رکھ کر انگریزی حکومت نے یہ فائدہ اٹھایا کہ جمعیت تغلبندی کے مصارف میں بہت کمی ہو گئی صرف یہی نہیں کہ فوجی خدمات ادا کرنے میں جو خرچ ہوتا وہ بچ رہا، بلکہ حکومت نے فوج کی تعداد کو بھی اس سے کم کر دیا۔ جتنی از روئے معاہدہ اس کو رکھنی چاہیئے تھی خود کورٹ آف ڈائرکٹرز میں میجر مور نے جو بیان ۷ر نومبر ۱۸۵۳ء کو دیا تھا اس میں وہ لکھتا ہے کہ

• "ہم نے اپنی امدادی فوج کی رجمنٹوں کی عددی قوت کو پیدل فوج میں ایک ہزار بندوق برداروں سے گھٹا کر ۷۵۰ کر دیا اور سوار فوج میں ۵۰۰ شمشیر زنوں سے کم کرکے ۴۲۰ کر دیا ہے[۱]۔ اور اس طرح گزشتہ

---

[۱] ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے طے ہوا تھا کہ ۱۰ ہزار سپاہیوں کی آٹھ پلٹنیں اور ایک ہزار سواروں کی دو رجمنٹیں رکھی جائیں گی مگر میجر مور کے بتائے ہوئے

۴۰ سال سے حیدرآباد کے علاقہ میں ہم نے جو فوج رکھی ہے وہ اس تعداد سے بقدر زاید از یک ربع کم ہے جس کے رکھنے کا ہم نے عہد کیا تھا اور جس کا خرچ بھی ہم پیشگی وصول کر چکے تھے۔ ہم نے اپنے عہد و پیماں میں یہ کوتاہی کس بناء پر کی؟ ہم کو اس فوج کا خرچ وصول کرنے کا کیا حق تھا جو در اصل ہم نے نہیں رکھی؟ اگر اوپر کے واقعات درست ہیں تو آیا ہم اس پر مجبور ہیں یا نہیں کہ ہم نے جو کچھ نظام سے وصول کیا ہے اور جس کا بدل ان کو نہیں دیا ہے اس کا حساب نظام کو دیں"[۵۱]

پس انصاف یہ چاہتا ہے کہ ۴۰ سال تک ۲۱۶۰ سپاہیوں کی کمی سے انگریزی حکومت جو روپیہ بچاتی رہی وہ نظام کو واپس دیتی۔ کم از کم اندازہ کے مطابق یہ رقم دو کروڑ روپیہ سے کم نہ تھی اور اس حساب سے ۱۸۵۳ء میں بجائے اس کے کہ کمپنی حضور نظام سے ۴۳ لاکھ روپیہ کے قرض کا مطالبہ کرتی حضور نظام کو اس قرض کی رقم وضع کر کے کمپنی سے ۱۵۷ لاکھ کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔

(۶) ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۳ء تک کمپنی ناجائز طور پر جالنہ اور سکندرآباد میں حضور نظام کی رعایا سے آبکاری کے محاصل وصول کرتی رہی ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء

---

[۵۱] میمو آئیرز صفحہ ۳۶۱

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰) حساب کے مطابق کمپنی نے سپاہیوں کی تعداد ۸ ہزار سے گھٹا کر ۶ ہزار کر دی اور سواروں کی تعداد ایک ہزار سے گھٹا کر ۸۴۰ (دیکھو ایچی سن جلد ۹ صفحہ ۶۸ و ۶۹)

میں سرکار نظام نے اس پر اعتراض کیا اور اپریل ۱۸۵۲ء میں خود نواب ناصر الدولہ بہادر نے اس مد کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی اس مد کی آمد ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور ۴۱ سال سے وصول کی جارہی تھی اگر اس کا سود نہ لگایا جاتا، تب بھی ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے ذمہ سرکار نظام کا ۴۱ لاکھ روپیہ واجب الادا تھا۔

یہی امور ہیں جن کی بناء پر انگریزی رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ۱۲/ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے مراسلہ میں صاف لکھ دیا تھا کہ

"میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کے مالی مطالبات کی غیر جانبداری کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے تو ہم ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) کے موجودہ قرض کا کوئی جائز دعویٰ نظام پر نہیں کرسکتے۔ جس وقت ہز ہائی نس کے مدارالمہام پر کنٹجنٹ کے بقایا کا تقاضا کیا گیا تھا اس نے ۱۹/ اگست ۱۸۵۱ء کو اپنے ایک نوٹ میں سکندر آباد اور جالنہ کی آبکاری کے محاصل میں سے فاضل باقیات کا مطالبہ کیا تھا۔ ہم اس آمدنی کو جو ایک لاکھ سالانہ تک پہونچتی ہے ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۳ء تک یعنی ۴۱ سال تک اپنے حساب میں وصول کرتے رہے حالانکہ یہ رقم بغیر کسی سود کے ہمارے مطلوبہ قرضہ میں سے ۴۱ لاکھ روپیہ نظام کے حساب میں جمع کر دیتی ...

...... مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی چاہیے کہ ۱۸۵۳ء ہم نظام پر کوئی جائز مالی مطالبہ نہیں رکھتے تھے یا اگر رکھتے بھی تھے تو بہت کم۔"[۵۱]

یہ ہے اس قرض کی حقیقت جس کے لئے نظام پر اس قدر سخت تقاضے کئے جا رہے تھے جس کے لئے نظام کی "دیانتداری" معرض بحث میں لائی جا رہی تھی اور جس کے لئے لارڈ ڈلہوزی انگریزی حکومت کے "حقوق" اور "مفاد" کی حفاظت کرنے پر اس قدر مستعدی کے ساتھ آمادگی ظاہر کر رہا تھا۔ بنئے مہاجن تو اپنے قرضداروں پر صرف اتنا ہی ظلم کرتے ہیں کہ اپنی بہی میں سود در سود لگا کر فرضی حساب بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے انہیں پہلے عدالت میں جانا پڑتا ہے پھر اسے قانوناً جائز ثابت کرکے ڈگری حاصل کرنی پڑتی ہے۔ پھر قرق امین کی خوشامد کرنی پڑتی ہیں لیکن بدقسمتی سے نظام کو جس قرض خواہ سے واسطہ پڑا تھا وہ بیک وقت مہاجن بھی تھا منصف بھی تھا اور قرق امین بھی، اس نے پہلے خود ہی حساب بنایا، پھر اپنے ہی حق میں ڈگری بھی دے لی۔ اور اس کے بعد خود ہی قرقی کا وارنٹ بھی لے آیا، ایسے دائن کے مقابلہ میں بیچارے مدیون کے لئے اپنی جائداد ضبط کرا دینے کے سوا اور کیا چارہ کار باقی رہ سکتا ہے

تفویض برار

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ ضبطی جائداد کی کارروائی کس طرح عمل میں آئی مارچ ۱۸۵۳ء میں کرنل لو رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا ۲۰ اپریل کو

سلہ میمو آئیرز صفحہ ۳۶۵

اسے نظام کے ساتھ ایک جدید معاہدہ کی گفت وشنید کے لئے خاص ہدایات وصول ہوئیں اور اس کے ساتھ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ بھی پہنچا جس میں کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ۳۶ لاکھ روپئے سالانہ کا ملک دوامًا برٹش گورنمنٹ کو تفویض کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ کرنل لو نے یہ مسودہ سراج الملک کو دکھایا تو انہوں نے اپنے آقا کے حق نمک کو فراموش کر کے اور خود اپنے وطن کی عزت کو بھلا کر جواب دیا کہ "ریاست کے معاملات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو اپنے تئیں خوش قسمت سمجھنا چاہیئے کہ انہیں ایسا معاہدہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ایک بچہ بھی اگر وہ تعصب اور غلط صلاح کاروں کے اثر سے پاک ہو تو وہ دیکھ لے گا کہ مجوزہ معاہدہ کو قبول کرنے میں نظام اور ان کی حکومت کے لئے بڑی اور واضح منفعت ہے۔ اس کے بعد جب یہی مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے سنتے ہی انہوں نے فرمایا کہ "خدا نہ کرے مجھے یہ ذلت سہنی پڑے"[۵۱] اس کے بعد اعلیٰ حضرت مغفرت منزل نے ایک تقریر کی جس کے بعض بعض حصے کرنل لو نے اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں نقل کئے ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں ان کے جذبات کیا تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ

"ہاں پہلے بھی تم مجھ سے کہہ چکے ہو کہ تم ایک نیا عہدنامہ تجویز کرنے والے ہو مگر تم نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میرے سامنے اس قسم کا معاہدہ پیش کیا جانے والا ہے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ تم مجھ سے

۵۱۔ دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۲۳ مئی ۱۸۵۳ء نمبر (۶۰)

میری مملکت کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی درخواست کرنا چاہتے ہو۔ کیا میں نے کبھی انگریزی حکومت سے جنگ کی ہے ؟۔ یا اس کے خلاف سازش کی ہے ؟ یا اس کا ساتھ دیتے رہنے اور اس کی خواہشات کی پیروی کرتے رہنے کے سوا کچھ اور کیا ہے کہ آج میری یہ تذلیل کی جا رہی ہے ؟"

کرنل لو نے جواب دیا کہ اس معاہدہ میں آپ کی تذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس پر مغفرت منزل نے فرمایا

"ایک بادشاہ کے لئے دو فعل ہمیشہ ذلت آمیز سمجھے جاتے ہیں ایک اپنے آبائی ملک کا کوئی حصہ چھوڑ دینا اور دوسرے اپنی بہادر اور کار آزمودہ فوج کو برطرف کر دینا۔ تم جیسے اصحاب کہ کبھی فرنگستان میں ہوتے ہو تو کبھی ہندوستان میں، کبھی امور سلطنت میں حصہ لیتے ہو تو کبھی سپاہی بن جاتے ہو، کبھی ملاحی کا پیشہ اختیار کرتے ہو تو کبھی بازرگانی کا (میں نے سنا ہے کہ تمہارے گروہ میں سے بعض بڑے آدمی سوداگر بھی رہے ہیں) تم اس معاملہ میں میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں ایک خاندانی رئیس ہوں اسی سلطنت میں جو سات پشت سے میرے خاندان میں چلی آ رہی ہے جینے اور مرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی اس سلطنت کا ایک حصہ دوا گا تمہاری حکومت میں دے کر خوش رہ سکتا ہوں ؟ اس پر خوش ہونا بالکل ناممکن ہے۔ مجھے اس کو

اپنی ذلت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے گروہ کے کوئی صاحب یہ خیال رکھتے ہیں کہ اگر مجھے بھی غوث خاں (نواب ارکاٹ) کی حالت میں رکھا جائے تو میں خوش اور مطمئن رہوں گا یعنی مجھے کسی پرانے ملازم کی طرح ایک وظیفہ دے دیا جائے اور میں کھانے، سونے اور نماز پڑھنے کے سوا کسی کام سے واسطہ نہ رکھوں۔ مگر (یہاں اعلیٰحضرت نے ایک عربی کا مقولہ نقل کیا ہے جسے کرنل لو نہیں سمجھ سکا) ..... خیر تم میرے شاہانہ احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم کہتے ہو کہ یہ معاہدہ کرنے سے مجھے ۸ لاکھ روپیہ کی بچت ہو جائے گی اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر ۸ لاکھ سے چہار چند بھی بچت ہو تب بھی میں مطمئن نہ ہوں گا کیوں کہ میں اپنا ملک چھوڑ کر اپنی عزت کھو دوں گا۔"[۵۱]

اس کے بعد نواب مرحوم نے رزیڈنٹ کو رام کرنے کی کوشش کی اور اس سے کہا کہ اگر محض کنٹینجنٹ اور پچھلے قرض کی خاطر یہ ملک مانگا جا رہا ہے تو میں چار مہینے کے اندر اندر قرض ادا کر دوں گا اور آئندہ کے لئے ماہ بماہ تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ مگر وہاں ملک لینے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس لئے رزیڈنٹ نے اس وعدہ کو قبول

---

۵۱ حیدر آباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۵۹۹ — ۶۰۱

کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اعلیحضرت نے کہا کہ :۔

"فرض کرو اگر میں یہ کہوں کہ کنٹیجنٹ ہی کو نہیں چاہتا تب تم کیا کرو گے؟"

کرنل لو نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں ہم کنٹیجنٹ کی برطرفی کو قبول کر لیں گے مگر اسے یکلخت برطرف نہیں کیا جائے گا بلکہ رفتہ رفتہ کیا جائے گا جس میں کئی سال لگیں گے اور اتنی مدت کے لئے پھر بھی ہم کو ان کی تنخواہوں کے لئے ان اضلاع کی ضرورت پڑے گی جو ہم مانگ رہے ہیں[1]۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خواہ کنٹیجنٹ رہے یا نہ رہے دونوں حالتوں میں ملک نہ چھوڑا جائے گا۔ پھر اعلیٰحضرت نے یہ تجویز پیش کی کہ ملک برار شمس الامراء امیر کبیر کے سپرد کیا جائے اور وہ قرض اور کنٹیجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام کریں مگر رزیڈنٹ نے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ برار کا علاقہ رزیڈنٹ اور شمس الامراء دونوں کے انتظام میں دیا جائے یہ دوعملی کی صورت ناقابل قبول تھی[2]۔ اس کے بعد رزیڈنٹ نے ۱۴ رمئی کو گفت و شنید کا سلسلہ بند کر دیا اور مطالبہ کیا کہ "ہاں" یا "نہیں" کا آخری جواب دیدیا جائے۔ پھر ۱۹ رمئی کو کرنل ڈیوڈسن (اسسٹنٹ

---

[1] حیدرآباد آفیرز جلد ۳ صفحہ ۲۰۷

[2] رشید الدین خانی ۷۴۶۔ کرنل لو نے بھی اپنے ۱۳ رمئی ۱۸۵۳ء نمبر ۷ میں اس کا ذکر کیا ہے

رزیڈنٹ) نے سراج الملک کے نام ایک خط بھیجا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میرے عزیز نواب۔ مجھے یقین ہے کہ رزیڈنٹ آج شام کو آپ سے ملاقات کرنے کی خواہش کریں گے۔ تاکہ آپ کو اطلاع دیں کہ نظام سے انکی گفت وشنید اب ختم ہوتی ہے۔ اور آج کی ڈاک سے وہ گورنر جنرل سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ فوجوں کو حرکت دیں۔"

ہزہائی نس نے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی مگر اس مدت میں بھی یقینی طور پر فوجوں کی تنخواہیں ادا کرنے کی شرط نہیں کی تھی۔ اس لئے اسے نامنظور کیا گیا تاہم اگر وہ ایسا کرتے تب بھی اسے نامنظور کیا جاتا۔ کیوں کہ یہ گورنر جنرل کی ہدایات کے خلاف تھا۔

ہزہائی نس نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ ۴۰ لاکھ کا ملک کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے شمس الامراء کے ہاتھ میں دیدیں۔ اس پر رزیڈنٹ نے کہا کہ "نہیں" کیونکہ ان کو اس امر کا یقین نہیں دلایا جاسکتا کہ ہزہائی نس کی حکومت، یا ان کے افسروں کی طرف سے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی لیکن اگر یہ تعلقے رزیڈنٹ اور شمس الامراء یا حیدرآباد کی حکومت کے کسی دوسرے افسر کو کمشنر بناکر سپرد کر بھی دیئے جاتے (اس طرح کہ انہی کو ان اضلاع کا پورا انتظام اور اختیار دیدیا جاتا اور وہ صرف ہزہائی نس کو سالانہ حساب دینے کے ذمہ دار ہوتے) تب بھی رزیڈنٹ صرف یہ

کر سکتے تھے کہ ان تجاویز کو کلکتہ بھیج دیتے ۔ باقی اسکی ذرہ برابر امید نہیں تھی کہ گورنر جنرل اس کو منظور کر لیں گے ۔

" ہز ہائی نس نے مذکورہ بالا تجویز (یعنی شمس الامراء اور رزیڈنٹ کی دوعملی) کو بھی قبول نہیں کیا ہے اس لئے انہوں نے اس چیز سے نجات حاصل کرنے کا آخری موقع بھی کھو دیا جو ان کے احساس وقار تمکنت کے منافی تھی اب وہی تجاویز جو پہلے پیش کیگئی تھیں اور پھر پیش کی جاتی ہیں اور ایسے غیر دوستانہ جذبات کے ساتھ کی جاتی ہیں جو میری رائے میں معاملات کو انتہائی حدود تک پہنچا دیں گے ۔ فی الحقیقت میرے پاس پونا سے میرے بھتیجے کا خط آیا ہے جس میں اطلاع دی گئی ہے کہ ۸ ۷ بائی لینڈرز اور ہز مجسٹی کی رجمنٹ نمبر ۸۶ کو حیدر آباد پر چڑھائی کے لئے تیار رہنے کے احکام پہنچ گئے ہیں ۔ یہ مت فرض کر لیجئے کہ فوجی کارروائی صرف اضلاع (برار) تک محدود رہے گی ۔ اگر آپ ہز ہائی نس کے دوست ہیں تو ان سے التجا کیجئے کہ اپنی ذات اور اپنی عزت کو بچانے کے لئے گورنر جنرل یقیناً ان کو مجبور کر دیں گے ۔"[1]

کوتھ ڈیوڈسن

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۲۱۴

یہ فوجی حملہ کی دھمکی کسی دشمن کو نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ ایک دوست کو دی گئی تھی۔ اور دوست بھی وہ وفادار دوست جس نے ابتدائے قیام سلطنت برطانیہ سے آج تک کبھی اس سلطنت کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی جو ۱۷۹۸ء سے لیکر آجتک ہر موقع پر اس سلطنت کا ساتھ دیتا رہا اور جس نے ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے خلاف اس سلطنت کی مدد کر کے اس کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط کیں مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا جبکہ نظام الملک کی نگاہ لطف کے بغیر مدراس میں فرانسیسیوں سے جان بچانی مشکل تھی، نہ وہ زمانہ رہا تھا جبکہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی تلوار سے بچنے کے لئے آصف جاہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ زمانہ باقی رہا تھا جبکہ مرہٹوں کی خطرناک طاقت کو مٹانے کے لئے یار وفادار کی مدد درکار تھی، اب وہ تمام نازک زمانے گذر چکے تھے اور انگریزی سلطنت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ دوستوں کی دوستی اس کے لئے کچھ زیادہ قیمتی نہ رہی تھی اس لئے پرانا آئین وفاداری بدل گیا۔ مہر و محبت کی رسم کہن ختم ہو گئی اور دشمن کو دشمنی کی پاداش میں نہیں بلکہ دوست کو دوستی کے جرم میں وہ بدلہ دیا گیا جو اشر فا دشمنوں کو بھی کم دیتے ہیں۔

نواب ناصر الدولہ حیدر آباد پر فوج کی چڑھائی کے معنی سمجھتے تھے۔ مقاومت بے سود تھی، عربوں، روہیلوں اور دوسری جنگجو قوموں کی بے قاعدہ فوج اگر لڑتی بھی تو کمپنی کی باقاعدہ فوج کے سامنے چند

گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹھیر سکتی تھی۔ اس کے بعد پوری ریاست پر قبضہ کیا
جاتا اور نظام الملک آصفجاہ کے خاندان کے ساتھ بھی خاکم بدہن وہی
سلوک کیا جاتا جو اورنگ زیب عالمگیر کے خاندان کے ساتھ دہلی میں کیا گیا
لہذا کرنل ڈیوڈسن کے خط کا جواب وہی ہو سکتا تھا جو دیا گیا۔ یعنی دوسرے
ہی روز سراج الملک نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ اعلیٰ حضرت معاہدہ کو
منظور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۸۵۳ء کو کرنل لو خوش خوش
دربار میں حاضر ہوئے اور تفویض برار کے معاہدہ پر دستخط لیکر واپس گئے
اس معاہدہ کے اہم نکات محتاج تشریح ہیں۔

(۱) واقعات سے ظاہر ہے کہ نظام اس دستاویز پر دستخط کرنے کیلئے
بالکل راضی نہ تھے، انہوں نے آخر وقت تک اسے قبول کرنے سے انکار
کیا اور صرف اس وقت اس کی توثیق کی جب انہیں یقین دلایا گیا کہ
مزید انکار کی پاداش میں ان کی سلطنت اور ان کی جان تک کی
خیر نہیں ہے۔ خود کرنل ڈیوڈسن جو اس وقت اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھا
اور بعد میں رزیڈنٹ کے عہدہ پر ممتاز ہوا ۱۱ پنجم ۳ اکتوبر ۱۸۶۷ء
کے مراسلہ میں اعتراف کرتا ہے کہ "میں ان دھمکیوں اور بھبکیوں کا عینی
شاہد ہوں جو سابق نظام کو گورنمنٹ کی تجاویز قبول کرنے پر مجبور کرنے
کے لئے دی گئی تھیں"[اف]۔ اس تخویف مجرمانہ کے ساتھ جو معاہدہ عمل میں آیا، جو

اف Hyderabad affairs. Vol. 11. P. 432.

اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلا ہوا استحصال بالجبر تھا اور ساری کارروائی از اول تا آخر ناجائز تھی۔

(۳) امدادی فوج (سب سیڈیری فورس) کے متعلق ۱۷۹۸ء کے معاہدہ میں طے ہوا تھا کہ وہ ہزہائی نس ان کے ورثاء اور ان کے جانشینوں کی ذات کی نسلاً بعد نسل حفاظت کرے گی۔ اور تمام باغیوں اور ان لوگوں کو جو اس ریاست کے ممالک محروسہ میں شورش پھیلائیں نگونسار کرے گی۔ مگر ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ سبندی کے طور پر اس کو مالگذاری وصول کرنے کے لئے اقطاع ممالک میں متعین کیا جائے گا۔" (دفعہ ۵)

۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں نواب آصفجاہ نے ۶۳ لاکھ کا ملک دیکر مذکورہ بالا معاہدہ کی اس شرط کو منسوخ کرا دیا۔ "ذرا ذرا سی باتوں کیلئے استعمال نہیں کیا جائے گا اور اس کے بجائے دفعہ ۱۷ میں یہ طے کیا کہ جب کبھی نظام کی رعایا میں سے کوئی شخص سرکار نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے سے انکار کرے گا، یا شورش و بدامنی پھیلائے گا تو اس کے خلاف امدادی فوج کو استعمال کیا جا سکے گا لیکن ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۲ میں امدادی فوج کے استعمال پر پھر وہی قید لگا دی گئی جو ۱۷۹۸ء کے معاہدہ کی دفعہ ۵ میں ۶۳ لاکھ کا ملک لینے سے پہلے لگائی گئی تھی۔ دفعہ ۳ کی رو سے کنٹیجنٹ کے فرائض میں اس خدمت کو داخل کر دیا گیا جو ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے امدادی فوج کے فرائض میں شامل تھی۔

یہ ایک کھلی ہوئی فریب کاری تھی۔

(۳) کنٹنجنٹ کا خرچ جب تک نظام کے خزانہ سے وصول کیا جاتا رہا اسکی عددی قوت میں ایک آدمی کی کمی بھی گوارا نہ کی گئی۔ مگر جب اس کے مصارف کے لئے ملک مل گیا تو معاہدہ ہی میں یہ بات طے کر لی گئی کہ کنٹنجنٹ کی تعداد ۹ ہزار کے بجائے ۷ ہزار رہے گی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام کے ملک میں ان کی مدد کرنے کے لئے امدادی فوج ۹ ہزار کی تعداد میں رہنی چاہئے تھی لیکن ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۳ میں طے کیا گیا کہ اس فوج کی صرف ۳ پلٹنیں و ایک رسالہ حدود ریاست میں رکھا جائے گا حالانکہ آٹھ پلٹنیں اور ۲ رسالے رکھنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں ۶۳ لاکھ کا ملک لیا گیا تھا۔

(۵) کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے اور ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کا سود ۶ فیصدی کے حساب سے وصول کرنے کے لئے اس معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے صوبہ برار دوآبہ رائچور اور عثمان آباد و احمد نگر کی جانب چند سرحدی اضلاع اپنے قبضہ میں لے لئے جن کی مجموعی آمدنی اس وقت ۵۰ لاکھ سالانہ تھی۔ پہلے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ دوامی انتقال ملکیت کو نظام منظور کر لیں لیکن اسے نظام نے سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ پھر دوسرا مطالبہ یہ کیا گیا کہ تفویض دوامی ہو۔ مگر نظام کے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ پر برقرار رہیں گے۔ نظام نے اس کو بھی نامنظور کیا اس کے بعد

یہ چال چلی گئی کہ معاہدہ کے الفاظ کو مبہم رکھا گیا۔ نظام کو رزیڈنٹ کے ذریعہ یقین دلایا گیا کہ تفویض محض عارضی ہے اور وہ جب چاہیں "فک الرہن" کرا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف برٹش گورنمنٹ کو مطمئن کر دیا گیا کہ تفویض دوامی ہے اور برار اب ہمیشہ کے لئے ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ معاہدہ کی دفعہ ۶ میں صرف یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔

The Nizam hereby agrees to assignthe Districts

mentioned

(نظام اس تحریر کی رو سے مبینہ اضلاع کو تفویض کرنا قبول کرتے ہیں)

لیکن کرنل لو نے حضور نظام کو مطمئن کرنے کے لئے سرکاری طور پر (Formlly) انہیں یقین دلایا تھا جیسا کہ وہ خود اپنے ۴ ہر مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع صرف اس وقت تک کے لئے کنٹنجنٹ کے مصارف کے خاطر سپرد کئے جا سکتے ہیں جب تک ان کو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہے"[۱]

---

[۱] میمو آئیرز صفحہ ۴۱۶

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جب نظام کو کنٹیجنٹ کی ضرورت نہ رہے تو وہ اسے موقوف کر کے اپنے اضلاع واپس لے سکتے ہیں۔ مگر یہی کرنل لو اپنے مذکورہ بالا اعلان کے صرف ڈیڑھ مہینہ بعد ۱۹ جون ۱۸۵۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا سے کہتا ہے کہ

"جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اضلاع مستقل طور پر ہمارے ہاتھ میں رہنے کے لئے ہیں" ۵۱

خود لارڈ ڈلہوزی نے اپنی ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھا ہے کہ:۔

"نظام نے اول سے آخر تک ایسا رویہ ظاہر کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک کی دوامی تفویض سے قطعی اور شدید انکار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہاں تک اضلاع کو اس ضرورت سے ہمارے سپرد کرنے سے بھی انہوں نے کلیتہً نارضامندی کا اظہار کیا کہ شاہی حقوق انہیں کو حاصل رہیں"

لیکن یہی لارڈ ڈلہوزی فروری ۱۸۵۶ء میں کہتا ہے کہ

"ایک معاہدہ کی رو سے جو ۱۸۵۳ء میں کیا گیا ہز ہائی نس نظام نے صوبہ برار اور اپنی ریاست کے دوسرے اضلاع کو آنریبل ایسٹ انڈیا کی کمپنی کی حکومت میں دائمی طور پر تفویض کر دیا تاکہ حیدرآباد کنٹیجنٹ مستقل طور پر رکھی جائے" ۵۲

اس سے گورنر جنرل اور رزیڈنٹ دونوں کی بدنیتی ظاہر ہے۔

---

۵۱ میمو آئیرز ۲۱۷ ۵۲ میمو آئیرز صفحہ ۲۱۷

یہ تھا اس درخت کا پھل جسے ۵۰ سال پہلے بویا گیا تھا۔ پہلے یار وفادار سے کہا گیا کہ ہم دشمنوں سے تمہارے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ کا ملک لیا گیا جو یار وفادار کے کل مقبوضات کا تیسرا حصہ تھا اس کے بعد خود اپنی اغراض کیلئے ایک فوج رکھی گئی اور اس کا خرچ دوست سے مانگا گیا۔ غریب دوست اس کے لئے بھی ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیتا رہا۔ مگر جب اس کا خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور اس میں اتنا خرچ دینے کی استطاعت نہ رہی تو اپنی فوج پر خود اپنے خزانہ سے روپیہ خرچ کیا گیا، اور اسے دوست کے حساب میں قرض کے طور پر لکھا جاتا رہا۔ جہاں تک دوست کے امکان میں تھا اس نے اس قرض کو بھی ادا کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب اس کے بدن میں ایک خون کا قطرہ بھی نہ رہا تو انہی دوستوں نے جو اس کے محافظ بنکر آئے تھے اس غریب کے گلے پر چھری رکھکر اسی ملک کا ایک دوسرا زرخیز حصہ اس سے چھین لیا جسکی حفاظت کے لئے وہ اس سے پہلے ایک بڑا حصہ لے چکے تھے۔ حفاظت کی تمام اقسام میں یہ سب سے زیادہ عجیب و غریب قسم ہے جس کی ایجاد پر جزیرہ انگلستان کے باشندے بجا فخر کر سکتے ہیں۔!

۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے دولت آصفیہ کو اپنی حفاظت میں لیا تھا۔ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۱۷ء کی لڑائیوں کے بعد جنوبی ہند میں کوئی طاقت ایسی نہ رہی تھی جس سے دولت آصفیہ کو کوئی خطرہ ہوتا۔ حدود ریاست کی چاروں طرف اسی سلطنت برطانیہ کے علاقے پھیلے

ہوئے تھے جو ریاست کی محافظ تھی اُس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ
ریاست کے حساب میں فوج کا خرچ سب سے کم ہوتا لیکن دنیا یہ سنکر حیران
ہوگی کہ انگریزوں کی محافظت میں آنے اور سب دشمنوں سے مطمئن ہوجانیکے
بعد اس ریاست کا فوجی خرچ اتنا بڑھ گیا کہ اس وقت دنیا کی کسی سلطنت کا
خرچ اتنا نہ تھا۔ سب سیڈیری فوج پر ۲۳ ۶ لاکھ کنٹنجینٹ پر ۴۲ لاکھ اور خود
اپنی قومی فوج پر ۶۴ لاکھ یعنی کل ایک کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ سالانہ وہ حکومت
خرچ کررہی تھی جس کی کل آمدنی ۲ کروڑ سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے الفاظ
میں دس روپیہ کی آمدنی رکھنے والا شخص اپنے چوکیدار کو ۹ روپے دیتا
تھا اور خود اپنا گذر صرف ایک روپیہ میں کرتا تھا۔

۱۸۴۳ء جبکہ مغفرت منزل نواب ناصر الدولہ نے اس ریاست کا
انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ریاست کے مداخل و مخارج کی
حالت یہ تھی۔[۱]

آمدنی بوضع اخراجات نظم و نسق	۱۲۲۴۹۵۴۵ (کلدار)
خرچ خاندان شاہی و ملازمین بارگاہ	۲۸۰۱۰۲۷
کنٹنجینٹ و اراد پیسائی کی چوتھ وغیرہ	۴۰۲۴۱۱۴
شاہی فوج	۶۴۱۳۸۵۲
منصب دار وغیرہ	۱۷۸۰۱۲۶

---

[۱] حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۹۱ و ۹۲

خرچ کل ۱۵۰۱۹۱۱۹

خسارہ ۲۷۳۹۵۷۴

ایسی خراب مالی حالت میں ریاست کو سنبھالنا انسانوں کا نہیں فرشتوں کا کام تھا۔ جس ریاست میں پیہم ۲۷ لاکھ کا سالانہ گھاٹا آرہا ہو اور باوجود اس کے اس پر ۳۸ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل بار بھی ڈالدیا گیا ہو اس کا اس طرح مالی انتشار میں مبتلا ہو جانا بالکل ایک قدرتی بات تھی جیسا کہ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا ہے۔

"حقیقۃً تعجب اس پر نہیں کہ یہ ریاست ۱۸۵۳ء میں ۴۳ لاکھ کی "قرضدار" کیوں تھی۔ بلکہ اس پر ہے کہ ۵۰ سال تک اس بری طرح لٹنے اور تباہ ہونے کے باوجود وہ صرف ۴۳ لاکھ ہی کی قرض دار کیوں رہی۔ اس کا بالکل دیوالہ کیوں نہ نکل گیا۔

غدر میں نظام دکن کی وفاداری

تفویض برار کے عہدنامہ پر دستخط ہونے کے پانچ روز بعد سراج الملک کا انتقال ہو گیا کسی شاعر نے ان کا مادۂ تاریخ اس طرح نکالا ہے۔

این بگردآخر شش سراج الملک

جملہ ملک برار دادو برفت

ان کے بعد ان کے بھتیجے نواب سالار جنگ بہادر مدارالمہام بنائے گئے اور راجہ نرندر بہادر (ابن راجہ دہراج بہادر ابن راجہ چندو لال)

کو پیشکاری کا عہدہ دیا گیا۔ نواب ناصرالدولہ بہادر۔ غفران منزل عہدنامہ تفویض برار پر دستخط کرنے کے بعد چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے اور اس کا رنج آخران کی جان ہی لیکر رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نواب افضل الدولہ مسند نشین ہوئے۔ جنہوں نے غفران منزل کے انتظامات کو سنبھال رکھا۔

یہی زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں وہ جنگ آزادی برپا ہوئی جو غلطی سے "غدر" کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ اپنے ہاتھوں سب کھو چکنے کے بعد ہندوستانیوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب سب کچھ بگڑ چکا تھا۔ تاہم یہ آخری سنبھالا بھی اتنے زور کا تھا کہ ایک دفعہ انگریزی سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اس وقت بمبئی کے گورنر نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو تار دیا کہ:۔

If The Nizam goes all is lost.

(نظام گئے تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا)

فرمانروائے دکن کی قوت اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی زبردست تھی کہ اگر وہ انگریزی سلطنت کے دشمنوں میں شامل ہو جاتے تو یہ سستے داموں حاصل کی ہوئی سلطنت سستے داموں نکل جاتی اور اگر پھر واپس ملتی بھی تو بہت مہنگے داموں ملتی۔ ایک انگریز مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے۔

"اگر نظام بگڑ بیٹھتے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا نتائج رونما ہوتے

ناگپور میں عین موقع پر جس سازش کا انکشاف ہوا تھا اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ آس پاس کی ریاستیں بغاوت کے لیے کس قدر
تیار بیٹھی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ٹرپلکین کے مسلمان ملیبار فصل پر
دست درازی کے لئے صرف حیدرآباد کی طرف سے اشارہ کے
منتظر بیٹھے تھے مجھے جس کسی فوجی آدمی سے گفتگو کرنے کا اتفاق
ہوا اس نے یہی کہا کہ اگر حیدرآباد اٹھ کھڑا ہوتا تو ہم کرنول، ناگپور
بلاری، کڑپہ، بنگلور، مدراس، ترچناپلی اور دوسرے شہروں میں
بغاوت سے نہ بچ سکتے اور یہ بھی مشکل تھا کہ بمبئی جو مدراس ہی کی
طرح بے چین تھا۔ اس مرض متعدی کے اثر سے بچ رہتا۔"

لیکن ان تمام بیوفائیوں اور بدعہدیوں کے باوجود انگریزی حکومت
نے نواب میر نظام علی خاں کے انتقال سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کی
تھیں۔ اور اس ظلم عظیم کے باوجود جو چار ہی سال پہلے برار کے
استحصال بالجبر کی صورت میں کیا گیا تھا۔ نظام انگریزی حکومت کی
وفاداری پر ثابت قدم رہے۔ ان کی رعایا میں قومی و مذہبی جوش
پورے زور کے ساتھ بھڑک چکا تھا۔ حیدرآباد کے مسلمان جہاد کے لئے
بے چین تھے۔ نظام اور ان کے مدارالمہام پر مذہب و قومیت کی خاطر
ہر قسم کی ترغیبات کا زور ڈالا جارہا تھا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ
اس نازک وقت میں یہ بات انگریزوں کی قدرت سے بالکل باہر تھی
کہ نظام کو وفادار رہنے پر مجبور کرسکتے۔ لیکن نواب آصف جاہ نے

صرف یہی نہیں کہ اپنا وزن دشمنوں کے پلڑے میں ڈالنے سے احتراز کیا بلکہ اس سے بڑھکر انہوں نے اپنی پوری قوت انگریزوں کی امداد واعانت میں صرف کردی اور انہی کی مدد سے سلطنت برطانیہ ہندوستان میں ازسرنو مستحکم ہوئی۔

جس وقت غدر کی اطلاع حیدرآباد پہونچی تو تمام شہر میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ ۱۴ر جون کو خفیہ طور پر ایک اشتہار شایع ہوا جس میں مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا گیا تھا۔ اس کے بعد مکہ مسجد میں ایک پرجوش جلسہ ہوا اور سبز علم بلند کردیا گیا۔ قریب تھا کہ ہنگامہ برپا ہوجاتا مگر سالارجنگ نے شہر میں عربی فوج کے پہرے لگوا دیئے اور تمام جوشیلے مجامع کو بزور منتشر کرا دیا۔ تاہم غیظ وغضب کی آگ جو انگریزوں کے خلاف بھڑک رہی تھی فرو نہ ہوئی اور آخرکار ۱۷ر جولائی کی صبح کو روہیلوں کی ایک زبردست جماعت نے رزیڈنسی پر حملہ کرہی دیا جسے بڑی مشکل سے روکا گیا اور حملہ آوروں کے لیڈروں میں سے ایک (طرہ باز خاں جمعدار) کو گولی ماردی گئی۔ اور دوسرے (مولوی علاؤالدین) کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اس وقت شہر میں تقریباً ۲۶ ہزار روہیلے سکھ، سندھی، حبشی، اور ترک ومغل موجود تھے اور شہر کی ۳ لاکھ آبادی کا بھی ایک بڑا حصہ مصلح تھا۔ خود سرکاری فوج کی ہمدردیاں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھیں جو انگریزوں کے اخراج کے لئے لڑنا چاہتے تھے ایسی حالت میں نواب افضل الدولہ اور سالارجنگ کیلئے

انگریزوں کی وفاداری پر قائم رہنا اور ان کی مدد کرنا جس قدر مشکل تھا ظاہر ہے، مگر ان تمام نازک حالات کے باوجود انہوں نے ثابت قدمی کے ساتھ پہلے اپنی ریاست میں امن قائم کیا اور اس کے بعد اپنی فوج سے برٹش گورنمنٹ کی امداد کی جس کی بدولت وسط ہند میں انگریزی تسلط از سر نو قائم ہوا۔ جھانسی، ہیمچ، اور دھید پور کے معرکے سر ہوئے اور ان زبردست طاقتوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو گیا جو ہندوستان کو سپید خطرے سے نجات دلانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس ہنگامہ میں نظام کی صرف مادی امداد ہی انگریزوں کے کام نہیں آئی بلکہ اخلاقی امداد نے بھی ان کو بہت کچھ سہارا دیا اور یہ اخلاقی امداد ایسی تھی جس کا اثر صوبہ سرحد کے دور و دراز علاقوں تک پہنچا ہوا تھا۔ سرسڈنے کاٹن جو ۱۸۵۷ء میں پشاور کی فوج کا کمانڈر تھا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

> "شمالی مغربی سرحد کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے متعدد مرتبہ مجھ کو یقین دلایا کہ کسی نہ کسی دن ہماری حکومت کے خلاف ایک عام بغاوت کھڑی ہو جائے گی۔ دہلی سے مغل اعظم کی نسل مٹ جانے کے بعد وہ نظام کو اپنا بڑا سردار اور اسلامی مقاصد کا سہارا سمجھتے ہیں"[۵۱]

---

۵۱ Nine years on the north west Frontier. P. 307.

حضور نظام کی ان عملی ہمدردیوں کے باوجود انگریز ان کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور انہیں ہر وقت یہ بدگمانی تھی کہ یہ سب کچھ خلوص کے ساتھ نہیں کیا جا رہا ہے لیکن آخر میں خود ریذیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کو اعتراف کرنا پڑا کہ :-

"میں نے ایسے کوششوں اور ایسے طریقوں سے جن پر شک سے کوئی شبہہ ہو سکتا تھا۔ نظام کی شدید نگرانی کی ہے اگرچہ پیغامبران کے پاس آتے تھے لیکن ان کی داستانیں سننے کے بعد وہ ہر ایسی تحریک میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے تھے، جو برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہوتی۔ ۹۵

وفاداری کا صلہ

حضور نظام کی اس بیش قیمت امداد اور مخلصانہ وفاداری پر زبانی تعریف و توصیف کے پھول تو بہت برسائے گئے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اسکی قدر دانی کا عملی ثبوت کیا دیا گیا؟ اس کے لئے ہم کو غدر کے بعد دونوں سلطنتوں کے معاملات پر ایک نظر ڈالنی چاہئیے۔

جولائی ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ کی جانب سے حضور نظام کو ۱۰ ہزار پونڈ کے اور سالار جنگ بہادر کو ۳ ہزار پونڈ کے تحائف

---

۹۵ Our faithful ally the Nizam. P. 291.

بھیجے گئے۔ مگر دستورِ قدیم کے مطابق اس کے جواب میں اعلیٰحضرت نے ۱۵ ہزار پونڈ کے تحائف گورنر جنرل کو بھیجے جو از روئے قاعدہ گورنمنٹ کے خزانہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس تجارت میں گورنمنٹ نے کھونے کے بجائے کچھ پا ہی لیا۔

غدر میں سرکار نظام کی فوج نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اور سلطنت برطانیہ کی حفاظت میں جو جاں نثاری کی تھی اس پر از راہ خوشنودی یہ انعام فرمایا گیا کہ جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کے لئے پانچ پانچ روپیہ مہینہ کا زائد بھتہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس "فضول خرچی" کا بوجھ سرکار انگریزی کے خزانہ پر نہیں پڑا بلکہ خود سرکار نظام ہی کے خزانہ پڑا کیونکہ یہ زائد خرچ برار کی آمدنی سے وصول کیا گیا۔ اور اسے نظام کے حساب میں محسوب کر لیا گیا۔

اس کے بعد اس "گرانمایہ عزت و احترام" کے مزید اظہار کیلئے جو "ملکہ معظمہ" کے دل میں ہز ہائی نس کے لئے موجود تھی سنہ ۱۸۶۰ء کے آخر میں ایک عہد نامہ لکھا گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غدر کی خدمات کا "اجر" تھا۔ اس معاہدہ میں "یار وفادار" پر جو انعام فرمائے گئے ان کی حقیقت ذرا تشریح کی محتاج ہے۔

(۱) دفعہ دوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے شورا پور کا علاقہ نظام کے کامل شاہی اختیارات میں دیدیا۔ اس علاقہ کی آمدنی ۳ لاکھ

۲۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ پہلے یہ علاقہ خود سرکار نظام کا تھا۔
۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۷ میں بتصریح گدوال کے ساتھ شوراپور
کے زمیندار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور عہد کیا گیا ہے کہ اگر وہ سرکار
نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے میں قاصر رہے گا۔ یا بد امنی
پھیلائے گا تو اس کے خلاف جمعیت تعلقہ داری (سبسڈیری فورس)
کو استعمال کیا جائے گا[1]۔ ۱۸۲۲ء میں سرکار نظام کو اس سے
شکایت ہوئی کہ چند سال سے نہ اس نے پیش کش حاضر کیا اور نہ
نذرانہ معاہدہ کے مطابق ریزیڈنٹ سے استمداد کی گئی تو اس نے
کیپٹن میڈوز ٹیلر کو تحقیقات کے لئے بھیجا اور آخر میں مطالبات
کی تدریجی تحصیل کے لئے دونوں سرکاروں کے اتفاق سے
اس کو پولیٹکل ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ چند سال اس طرح گذرے تھے
کہ شوراپور کے نوجوان راجہ نے سرکار نظام کے خلاف بغاوت
کردی اور اس کی سرکوبی کے لئے جمعیت تعلقہ داری کے بجائے
(جس کا معاہدہ میں وعدہ کیا گیا تھا) کنٹینجنٹ فورس کو بھیجا گیا۔
از روئے عقل اور از روئے قانون یہ لازم تھا کہ اس راجہ کو
از سر نو اپنی حکومت کا مطیع بنایا جاتا جس کا وہ پہلے باجگذار تھا
لیکن کیا یہ گیا کہ نظام کی فوج سے نظام ہی کی رعیت کے
ایک باغی سردار کی سرکوبی کی گئی۔ اور پھر نظام کے بجائے

---

[1] ایچیسن جلد ۹ صفحہ ۶۳

اس کا علاقہ انگریزی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا[۵۱]
یہی وہ صریح ظلم تھا جس کی تلافی ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں کی گئی اور یہ ایسی چیز تھی جس کو مشکل ہی سے صلہ و انعام کہا جا سکتا ہے
(۲) کنٹیجنٹ کے سلسلہ میں حضور نظام کے ذمہ جو ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کا "قرض" واجب الادا" تھا اس کو دفعہ سوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے معاف کر دیا۔
اول تو یہ قرض فی الواقع کوئی قرض نہیں تھا۔ گذشتہ صفحات میں اس کی جو حقیقت بیان کی جا چکی ہے، اسے پڑھنے کے بعد کوئی شخص نہ اسے قرض سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی معافی کو کسی انعام سے تعبیر کر سکتا ہے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ "قرض" ہی تھا۔ تب بھی جس صورت میں اسے معاف کیا گیا ہے وہ ایسی ہے کہ انگریزی حکومت بجائے نقصان کے فائدہ ہی میں رہی ہے۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) میں یہ طے ہوا تھا کہ رزیڈنٹ نظام کے تفویض کردہ علاقوں کی آمدنی اور خرچ کا صحیح اور ٹھیک ٹھیک حساب سرکار نظام کے سامنے برابر پیش کرتا رہے گا اور دفعہ ۶ کے مطابق تمام اخراجات وضع کر کے جو کچھ بچے گا۔ وہ سرکار نظام کے خزانہ

---

[۵۱] حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

میں داخل کر دے گا۔[1] اس میں شک نہیں کہ معاہدہ میں یہ تصریح نہیں کیگئی تھی کہ علاقہ مفوضہ کے نظم و نسق کے مصارف کیا ہونگے لیکن کرنل لو نے سرکار نظام کو یقین دلایا تھا کہ ۲ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱/۸ سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ کرنل ڈیوڈسن اپنے ۶ر جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں صاف لکھتا ہے کہ:-

"مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جنرل لوسی لے نے سابق وزیر سراج الملک اور موجودہ وزیر سالار جنگ کو یہ سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ ہمارے انتظام کا خرچ ۲ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱۲ ۱/۲ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا۔"[2]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ اپنے ۷ر جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں تسلیم کرتا ہے۔

"جب معاہدہ پر دستخط کئے گئے تھے تو نظام کو یہ توقع تھی کہ ان اضلاع کے انتظام کا خرچ ۲ر فی روپیہ یعنی ۱۲ ۱/۲ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا۔"[3]

لیکن ان تصریحات کے باوجود علاقہ مفوضہ کی ۴۵ لاکھ سالانہ

---

[1] ایچیسن جلد ۹ صفحہ ۹۶

[2] حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۲۱۰

[3] حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۲۱۴

آمدنی میں سے تقریباً ۲ لاکھ روپیہ سالانہ نظم و نسق پر خرچ کیا گیا جو ۹ آنہ اور ۱۰ آنہ فی روپیہ کے قریب تھا اور دوسرے اخراجات ملا کر اضلاع مفوضہ کی ساری آمدنی انگریزی حکومت نے خود ہی خرچ کر ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک بچت کی ایک پائی بھی سرکار نظام کے خزانہ میں داخل نہ کی گئی۔ خود گورنر جنرل اور رزیڈنٹ کو بھی اس فضول خرچی کا اعتراف تھا، کرنل ڈیوڈسن اپنے ۶ جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ:-

"میں یہ توقع کرتا ہوں کہ ضلع کے اخراجات کی بھاری رقم اور ہمارے انتظام کی فضول خرچی پر دربار (یعنی حیدرآباد کا مدارالمہام) اعتراض کرے گا" ؎

اسی اعتراض کے خوف سے سات سال تک اضلاع مفوضہ کے حسابات سرکار نظام کو نہیں دیئے گئے اور باوجود بار بار مطالبہ کرنے کے معاہدانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے پہلو تہی کی جاتی رہی جس کے متعلق لارڈ کیننگ کو اپنے ۷ جولائی ۱۸۶۰ء کے نوٹ میں اعتراف کرنا پڑا کہ:-

"از روئے معاہدہ ہم ان حسابات کو سال کے سال پیش کرنے پر مجبور تھے یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔"

؎ حیدرآباد آفیئرز صفحہ ۱۰۰-۱۰۱

اور لارڈ لارنس کو بھی ۱۳ر فروری ۱۸۶۷ء کے ایک مراسلہ میں تسلیم کرنا پڑا کہ :-

"سالانہ حسابات پیش کرنے میں کوتاہی کرنا ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) کے صریح الفاظ سے انحراف تھا"۔ [1]

اس خلاف ورزی معاہدہ سے برٹش گورنمنٹ سات سال تک جو ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی اور سرکار نظام کو اس کے تفویض کردہ علاقہ کے اس منافع میں سے ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) کی رو سے اس کو ملنا چاہئے تھا۔ محروم کرکے جو ظلم کرتی رہی اس کی تلافی کے لئے اس نے ۱۸۶۰ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر سرکار نظام برٹش گورنمنٹ سے مفوضہ اضلاع کا پچھلا حساب نہ مانگے تو اس کے عوض وہ اس ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کی رقم کو معاف کر دیگی۔ جو قرض کے طور پر سرکار نظام کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ۷ر جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں زیر بحث معاہدہ کی شرائط تجویز کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری نے کرنل ڈیوڈسن رزیڈنٹ کو لکھا تھا کہ :-

"گورنر جنرل اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ گذشتہ سالوں میں جو زائد سول اخراجات ہوئے ہیں ان کو نظام کی طرف سے ۵۰ لاکھ روپیہ حالی کے قرض کی ادائیگی کے طور پر تسلیم کرلیں"۔ [2]

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۴۲۱ و ۴۲۲

[2] حیدرآباد آفیرز صفحہ ۴۱۴ — ۴۱۵

اور یہی نہیں بلکہ اس پچاس لاکھ کے قرض کی معافی کے معاوضہ میں گورنمنٹ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ آئندہ کے لئے بھی سرکار نظام اضلاع مفوضہ کے حسابات کا مطالبہ نہ کرے اور مصارف کی کمی و زیادتی کو برٹش گورنمنٹ کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑ دے، چنانچہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ (۴) میں بتصریح یہ طے کر لیا گیا کہ ہزہائی نس نظام کی حکومت اضلاع مفوضہ کے سابق، حال اور آئندہ کے حسابات کا مطالبہ ترک کر دیگی اور اگرچہ برٹش گورنمنٹ پر لازم ہوگا کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے مقررہ مصارف وضع کر کے بچت کی رقم سرکار نظام کے خزانہ میں داخل کرے۔ لیکن مصارف کے تعین کا اختیار کلیتہً برٹش گورنمنٹ کو ہوگا۔[۵۱]

اس شرط سے برٹش گورنمنٹ نے جو فائدہ اٹھایا اس کا حال آگے آتا ہے اسے پڑھکر ہر شخص معلوم کرے گا کہ ۵۰ لاکھ کے قرض کی معافی کے بدلے میں اس نے ۳۲ سال کے عرصہ میں اس سے دہ چند فائدہ اٹھالیا پس اسکو بھی کوئی ذی ہوش "انعام" سے تعبیر نہیں کرسکتا۔

(۳) دفعہ ۵ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے اضلاع مفوضہ میں سے دوآبہ رائچور اور وہ اضلاع جو کلکٹری احمد نگر اور شولاپور سے متصل واقع ہیں سرکار نظام کو واپس کر دے اول تو یہ وہی اضلاع تھے جو ۱۸۵۳ء میں بزدستی سرکار نظام سے چھین لئے گئے تھے۔ دوسرے خود گورنر جنرل کے

---

۵۱ Aitchison. P. 105.

اعتراف کے مطابق کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے جتنے علاقہ کی ضرورت تھی اس کے لئے برار پائین گھاٹ اور بالا گھاٹ بالکل کافی تھے اور یہ علاقے قطعاً زائد از ضرورت لئے گئے تھے۔[1] اس لئے ان علاقوں کو کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے نام سے اپنے قبضہ میں رکھنے کا گورنمنٹ کو کوئی حق نہ تھا اور انہیں واپس کرنے پر وہ مجبور تھی لیکن اس اخلاقی و قانونی فرض کو بھی اس نے بلا معاوضہ انجام دیا۔ اس نے اس کے بدلے میں متعدد قسم کے فائدے اٹھائے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دفعہ ہفتم کی رو سے برار کے وہ تعلقے حاصل کئے جو صرفخاص کے علاقہ میں تھے اور جن کی آمدنی ۵۸۰۵۵۶ روپیہ سالانہ تھی۔

دفعہ ہشتم کی رو سے سرکار نظام کے وہ مقبوضات حاصل کر لئے جو دریائے گوداوری اور پائین گنگا کے دوسری جانب تھے ان اضلاع کی آمدنی ۱۶۵۷۷۵ روپیہ سالانہ تھی اور ان کے جنگلات کی لکڑی کی قیمت بھی ۵۰ لاکھ روپیہ سے کم نہ تھی۔[2] علاوہ ازیں اس علاقہ کے حاصل کرنے سے انگریزی حکومت کو فوجی فوائد بھی حاصل ہوئے جن کو کیپٹن ہیگ ....

ڈسٹرکٹ انجینئر نے اپنے ۳۰ اگست ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں بیان کیا ہے۔[3] اس علاقہ کو حاصل کرنے کے لئے برٹش گورنمنٹ اسقدر بے چین تھی کہ سرکار نظام کو

---

[1] دیکھو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری کا مراسلہ مورخہ ۷ جولائی ۱۸۶۰ء نمبر ۲۵۱۸ صیغہ خارجہ

[2] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۶ء

[3] حیدرآباد آفیئرز جلد ۲ صفحہ ۴۲۹

صاف طور پر لکھدیا گیا تھا کہ :-

"برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس نظام کو گوداوری کے تعلقوں کی تفویض سے پھر جانے کی ہرگز اجازت نہ دیگی - اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرینگے تو اس سے دونوں حکومتوں کے درمیان غیر دوستانہ اور غصہ و ناراضی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے"[۵۱]

یہ فوائد اٹھانے کے بعد اگر برٹش گورنمنٹ نے سرکار نظام کو خود اس کا زبردستی چھینا ہوا ملک واپس کر دیا تو اس کو مشکل ہی سے "انعام" کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت نے نواب افضل الدولہ بہادر پر یہ اثر جمانے کی کوشش تو ضرور کی تھی کہ یہ سب کچھ ان کی بیش قیمت خدمات کے صلہ میں انعام کے طور پر دیا جا رہا ہے لیکن کرنل ڈیوڈسن سے گفتگو میں انہوں نے صاف طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا کہ جو کچھ ان کا تھا وہی انکو دیا جا رہا ہے[۵۲]۔ خود انصاف پسند انگریزوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں انگریزی حکومت نے نظام کو جتنا فائدہ پہنچایا اس سے زیادہ خود حاصل کر لیا۔ چنانچہ ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۶۶ء کے ایک لیڈنگ آرٹیکل میں ٹائمز آف انڈیا نے صاف لکھا تھا کہ

"معاہدہ کی گفت و شنید میں ہم نے بہت سے فوائد حاصل کر لئے اس معاملہ سے جو لوگ بہتر واقفیت رکھتے ہیں ان کا قول ہے کہ سنہ ۱۸۶۰ء کے ضمنی معاہدہ میں منافع و فوائد کے ترازو کا پلڑا ہماری طرف زیادہ جھکا ہوا تھا"

---

[۵۱] حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۲۶۰

[۵۲] " " " صفحہ ۴۲۰

سر سالار جنگ کا مطالبہ استرداد برار

سر سالار جنگ مرحوم جو معاہدۂ تفویض برار کے ایک ہی ہفتہ بعد اپنے
چچا سراج الملک کی جگہ مدارالمہام بنائے گئے تھے۔ اپنے خاندان کی پیشانی
پر اس کو بڑا داغ سمجھتے تھے کہ اس کے ایک فرد کی وزارت میں ملک برار
دولت آصفیہ کے قبضہ سے نکلا ہے ایک مرتبہ انہوں نے خود انگریزی
رزیڈنٹ کرنل لومسڈن (Lumsden) سے کہا تھا کہ

"ان اضلاع کی تفویض کا واقعہ میرے چچا کی زندگی کے آخری لمحوں میں
پیش آنے سے والئ ملک اور اہل ملک کی نظروں میں میرے خاندان کی
رسوائی ہوئی ہے۔ اعلحضرت مغفرت مکاں نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ
ان اضلاع کی واپسی کے لئے اپنا سارا زور صرف کردو اور میں نے ان سے
وعدہ کیا تھا کہ اپنے خاندان پر سے اس داغ کو دور کرنے میں کوتاہی
نہ کروں گا۔"[۱]

یہی خیال تھا جس کی بناء پر ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک سات سال کی مدت
میں انہوں نے کم از کم چھ مرتبہ واپسی برار کی درخواست کی[۲]۔ مگر یہ درخواست
چونکہ محض درخواست تھی۔ اس میں مطالبہ کا زور نہ تھا اس لئے اس کی طرف
توجہ نہیں کی گئی۔ اور ۱۸۶۰ء میں مفوضہ علاقہ کا کچھ واپس کرکے اُن کی اشک شوئی

۱؎ حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۳۵۶

۲؎ " " " ۳۸۰

کردی گئی۔ لیکن سالار جنگ اس سے مطمئن ہونے والے نہ تھے وہ اس مطالبہ کے لئے ایک اچھے موقع کے منتظر تھے اور وہ موقع میسور کے واقعات نے ان کو بہم پہونچا دیا۔

۱۷۹۹ء کی جنگ میسور میں جب ٹیپو سلطان کی پوری مملکت فتح ہو گئی تو ازروئے معاہدہ یہ ضروری تھا کہ ملک کو انگریزی حکومت اور سرکار نظام کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا جاتا لیکن ایچی سن .... کے بقول انگریزی حکومت نے اس خیال سے کہ نظام کی طاقت حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے میسور کے اس پرانے شاہی خاندان کو جسے حیدر علی نے بیدخل کر دیا تھا ڈھونڈ کر نکالا اور ۷۶ء ۷۰ء ۴۷ ہن کا ملک دیکر تین برس کے ایک بچے کو اس کا راجہ بنا دیا۔[۱] چونکہ یہ ریاست محض نظام کے توڑ پر قائم کی گئی تھی اس لئے انگریزی حکومت کی سیاست کا میلان اسی طرف رہا کہ جب کوئی بہانہ ملے تو اسے مٹا کر سارا ملک انگریزی مقبوضات سے ملحق کر لیا جائے چنانچہ ۱۸۳۱ء میں مہاراجہ کی فضول خرچی کے بہانہ سے اس میں مداخلت کی گئی اور ۱۸۳۴ء میں ساری ریاست انگریزی انتظام میں لے لی گئی ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ میسور نے اپنے ملک کی بحالی کا مطالبہ کیا مگر اسے رد کر دیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے پھر مطالبہ کیا اور اسے پھر جواب ملا کہ مہاراجہ نہ کسی حق کے طور پر ریاست کی بحالی کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور نہ اسے بحال کرنا باشندگان ریاست کے مفاد کے لئے مفید ہو سکتا ہے ۱۸۶۴ء میں مہاراجہ نے ایک لڑکے کو متبنیٰ

---

[۱] ایچی سن جلد ۹ صفحہ ۱۸۲ — ۱۸۳

بنانے کی اجازت مانگی تو اسے بھی رد کر دیا گیا اور ۱۸۶۵ء میں جب مہاراجہ نے ایک لڑکے کو گود لے لیا تو برٹش گورنمنٹ نے اس کارروائی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ کے اس رویہ سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے ملک کو ملحق کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اس لئے سالار جنگ نے اس موقع کو اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے موزوں خیال کیا اور ۲۷ر اکتوبر ۱۸۶۶ء سر جارج یول (رزیڈنٹ) کے نام ایک خط لکھا جس کے اہم نکات حسب ذیل تھے۔

(۱) ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ برار کی آمدنی میں سے جو کچھ مد وہ ہو گی اسے سرکار نظام کے حوالے کر دے گی لیکن معاہدہ کی تکمیل کو چھ سال گذرنے کے باوجود اس سرکار کو ایک پیسہ بھی بچت کا نہیں ملا اور نہ آئندہ ملنے کی امید ہے کیونکہ برار کی ۵۰ لاکھ آمدنی میں سے ۲۳ لاکھ روپیہ صرف نظم و نسق میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ سرکار نظام اس وقت روپے کی سخت ضرورت مند ہے اور وہ اس کا حق رکھتی ہے کہ کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کا دوسرا اطمینان بخش انتظام کر کے اپنے ان اضلاع کو واپس لے لے۔

(۲) برٹش گورنمنٹ نے میسور کے علاقہ کو ملحق کر لینے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے اس لئے سرکار نظام کو اس علاقہ میں سے اسی طرح حصہ لینا چاہئے جس طرح ۱۷۹۹ء کے معاہدہ تقسیم میسور میں ملا تھا اگر برٹش گورنمنٹ میسور کی نئی ریاست قائم نہ کرتی تو بلا شک و ریب یہ ملک سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان تقسیم ہوتا جس طرح اسوقت اس ریاست کا قیام سرکار نظام کی موافقت سے

ہوا تھا۔ اسی طرح اب اس کا سقوط بھی اگر ہو تو سرکار نظام کی موافقت سے ہونا چاہئے

(۳) ۱۸۰۰ء کے خفیہ معاہدہ کی دفعہ ۳ میں طے ہوا تھا کہ آئندہ جو علاقے دونوں حکومتوں کی متحدہ افواج کی قوت سے فتح ہوں گے وہ دونوں حکومتوں کے درمیان برابر تقسیم کئے جائیں گے۔ چنانچہ اسی دفعہ کے ماتحت ۱۸۰۴ء اور ۱۸۲۱ء میں سرکار نظام کو پیشوا اور سندھیا کے مفتوحہ علاقوں میں سے حصہ دیا گیا تھا اور اب اسی معاہدہ کے مطابق کرنول اور گومسور کے علاقوں میں سے سرکار نظام کو کم از کم ۱۵۰۰۰ روپیہ سالانہ کا حصہ ملنا چاہئے کیونکہ ان علاقوں کی فتح میں اس سرکار کی فوج شامل تھی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے کرنول کا صرف پیش کش تفویض کیا گیا تھا نہ کہ اصل علاقہ از روئے آئین ملک بدستور سرکار نظام کی ملک رہا اور اس حق ملکیت کو اس سرکار نے کبھی تفویض نہیں کیا اس لئے اسکی آمدنی (پیشکش کو وضع کرکے) اس سرکار کا حق ہے۔

ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے سرکار نظام کے حقوق حسب ذیل ہیں۔

کرنول کی مالگذاری بوضع پیش کش	۱۷۰۰۰۰
گومسور کی مالگذاری میں سرکار نظام کا حصہ	۱۵۰۰۰
میسور کی ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کا نصف	۳۱۵۰۰۰
جملہ	۶۰۰۰۰۰

چونکہ ابھی ریاست میسور کے انقراض کا مسئلہ طے نہیں ہوا ہے۔ اس لئے فی الحال اسے چھوڑ کر اول الذکر دو علاقوں کا ۱۸۵۰۰۰ روپیہ سالانہ منجنٹ

کے مصارف کے لئے قبول کیا جائے اور بقیہ ۸۵۰۰۰ روپیہ کے لئے ملک میسور کا تصفیہ ہونے تک ہم قابل اطمینان ضمانت فراہم کر دیں گے اس انتظام کے بعد ملک برار سرکار نظام کو واپس دیدیا جائے[۱۵]

اس مراسلہ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ برار کی آمدنی میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ سال کے ختم ہونے سے پہلے سرکار نظام کو دینے کے احکام جاری ہو گئے دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۷ء میں مہاراجہ میسور کے گود لئے ہوئے لڑکے کو ان کا وارث تسلیم کر لیا گیا اور مہاراجہ کے مرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس لڑکے کی گدی نشینی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

دوسری طرف سر سالار جنگ کے اس خلاف توقع مطالبہ سے برطانی حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو رزیڈنٹ نے ایک طویل نوٹ کے ساتھ سالار جنگ کا خط گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیجا اور اس میں بڑی کاوش سے ان کے دلائل کی تردید کی اس کے جواب میں ۱۳ فروری ۱۸۶۷ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری مسٹر وائلی ۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ نے حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا جس کے ابتدائی فقروں میں یہ فقرہ خصوصیت کے ساتھ ان جذبات غیظ و غضب کو ظاہر کرتا ہے جو مال مغصوبہ کی بازطلبی پر غاصبوں کی جماعت میں ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اس میں لکھا تھا کہ

"وائسرائے یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ حکومت حیدرآباد کے موجودہ وعادی

---

[۱۵] حیدرآباد افیئرز جلد ۲ صفحہ ۶۲۵ — ۶۵۲

صحیح اور مبنی بر انصاف ہیں۔ کونسل میں ان پر اسی قدر گہرا اور متفکرانہ
غور وخوض کیا گیا جس قدر مسئلہ کی اہمیت اور اس سے زیادہ خود ہز ہائی نس
کی آزمودہ وفاداری متقاضی تھی مگر ہز اکسلنسی نے اس نتیجہ پر پہونچنے کے
لئے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ یہ دعاوی کلیتہً بے بنیاد ہیں اور صحت ودرستی
کا شائبہ بھی ان کی تائید میں موجود نہیں ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے
یہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کہ کسی دیسی ریاست کی درخواست پر سخت
الفاظ میں کلام کرے۔ مگر سر سالار جنگ کے خط میں فضول اور ادعا کی جو
روح بھری ہوئی ہے جو ان کے شاہی آقا کے مرتبے اور خود انکی شان
تدبر دونوں کے خلاف ہے وہ گورنر جنرل کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی
نہیں رہنے دیتی کہ وہ آئندہ کیلئے یہ درخواست کریں کہ دربار حیدرآباد کی
خط وکتابت اس سے زیادہ سنجیدگی اور ہوشمندی کے ساتھ ہونی چاہئے"[1]

فی الواقع یہ تنبیہ تھی بھی معقول کیونکہ حق طلب کرنا، معاہدات کی پابندی
پر زور دینا اور برسوں کے کھائے ہوئے مال کو اگلوانے کی کوشش کرنا یہ سب
کے سب نہایت غیر سنجیدہ اور غیر ہوشمندانہ افعال ہیں اور ان کا ارتکاب
انگریز کے سوا کوئی اور کرے تو وہ اسکی شاہانہ قدر ومنزلت اور مدبرانہ
شان دونوں کے عین منافی ہے کیونکہ دوسروں کے لئے تو یہی سزاوار ہے
کہ اپنا مال دیں اور پھر پلٹ کر نہ مانگیں۔

ایک طرف سالار جنگ کو یہ جواب دیا گیا دوسری طرف ۱۴ فروری ۱۸۶۷ء

[1] حیدرآباد افیرز جلد ۲ صفحہ ۶۵۶

کو سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کرینبورن .... کے نام
سالار جنگ کا خط ایک طویل نوٹ کے ساتھ بھیجا گیا اور انہیں لکھدیا گیا کہ

"ہم پوری احتیاط کے ساتھ تحقیقات کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ
بیان کردہ قرضوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور چونکہ وہ سمجھوتہ جسکی
رو سے برٹش گورنمنٹ نے زیر بحث مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے
اسکی روح ہی یہ ہے کہ ہمارے پاس ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے
ایک ایسا مستقل ذریعہ آمدنی ہونا چاہیئے جو اس کے لئے کافی ہو اس لئے
ہم نے دربار کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم موجودہ تفویض پر اس کسی ترمیم کے
فتح باب کی کوئی وجہ نہیں پاتے"[۱]

اس کے جواب میں ۱۳ مئی ۱۸۶۷ء کو لارڈ اسٹیفرڈ نارتھ کورٹ
سکریٹری آف اسٹیٹ نے لکھا کہ

"میں اس باب میں آپ کی رائے سے پورا اتفاق رکھتا ہوں کہ اس
قرض کا کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کے متعلق دربار حیدرآباد نے
بیان کیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ذمہ ہز ہائی نس نظام کی طرف سے
واجب الادا ہے اور جس کو ہز ہائی نس نے اپنی موجودہ درخواست کی
بنیاد قرار دیا ہے"۔ اب رہا وہ دعویٰ جو متوقع انقراض ریاست میسور میں
برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ حصہ لینے کے متعلق نظام نے پیش کیا ہے تو
برٹش گورنمنٹ یہ تسلیم ہی نہیں کرتی کہ علاقہ میسور میں نظام کچھ حقوق مستلزم الاستقرار

[۱] حیدرآباد آفیئرز جلد ۲ صفحہ ۶۴۸

کہتے ہیں تاہم سردست یہ کہدینا کافی ہے کہ سر سالار جنگ کے پیش کردہ دعاوی ایسے مفروضات و قیاسات پر قایم کئے گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں اس لئے ان پر بحث کرنا بالکل غیر ضروری ہے

اس طرح یہ معاملہ یہیں ختم کردیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد نواب مغفرت مکاں فضل الدولہ بہادر کا انتقال ہو گیا۔ فروری ۱۸۶۹ء میں نواب میر محبوب علیخان بہادر تین سال کی عمر میں وارث تخت و تاج ہوئے سر سالار جنگ ان کے ایام نا بالغی میں مختار ریاست بنائے گئے اور نواب شمس الامراء امیر کبیر کو شریک مختار بنایا گیا شمس الامراء اور سالار جنگ کے خاندان میں پرانی مخالفت تھی لیکن دونوں ریاست کے خیر خواہ تھے اس لئے جہاں تک ریاست کے مفاد کا تعلق تھا دونوں ایک متفقہ پالیسی پر کار بند رہے اور استرداد برار کی طرف دونوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی۔

۴ ام فروری ۱۸۶۹ء کے مراسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا نے تفویض برار کے معاہدہ میں ترمیم و تنسیخ کا دروازہ کھولنے سے صرف اس بناء پر انکار کیا تھا کہ گورنمنٹ کو کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے "ایک مستقل ذریعہ آمدنی" کی ضرورت تھی اس لئے سر سالار جنگ نے "ایک مستقل ذریعہ آمدنی" مہیا کرنے ہی کی طرف ساری توجہ منعطف کردی اور آخر کار اپنی اعلیٰ قابلیت سے انہوں نے ۹ کروڑ روپیہ کا انتظام کرکے ۹ ام ستمبر ۱۸۷۲ء کو دوبارہ مسئلہ برار کا افتتاح کیا اور گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم کنٹیجنٹ کے مصارف کے لئے ۸ ملین پونڈ کی نقد رقم جمع کرا دیتے ہیں کہ اور اس طرح وہ "مستقل ذریعہ آمدنی" گورنمنٹ کے ہاتھ آجاتا ہے جس کی خاطر ملک برار سرکار نظام سے لیا گیا ہے۔ اگر کوئی نیک نیت حکومت ہوتی تو یقیناً اس تجویز کو منظور کر لیتی۔ کیونکہ ۸ ملین پونڈ کا صرف سود ہی کنٹیجنٹ سالانہ مصارف

کے لئے کافی تھا لیکن وہاں تو اصل مقصود کنٹنجنٹ نہ تھی بلکہ برار تھا۔ اس لئے
۲۴ ستمبر ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری نے رزیڈنٹ کی معرفت
یہ مختصر سا جواب دیدیا کہ ''اول تو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کو قائم رکھنا
یا بدل دینا تنہا حکومت حیدرآباد کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اس کے لئے
دونوں حکومتوں کی رضامندی درکار ہے'' دوسرے مذکورہ بالا دونوں
معاہدوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ''کنٹنجنٹ کے مصارف کے لئے ارضی ضمانت
(ٹیریٹوریل گارنٹی) مہیا کی جائے'' چھ سال پہلے تک
انہی معاہدوں کی روح صرف یہ تھی کہ ''مستقل ذریعہ آمدنی'' برٹش گورنمنٹ
کے ہاتھ میں ہو مگر جب وہ ''مستقل ذریعہ آمدنی'' ہاتھ میں دینے کا بندوبست
ہوگیا تو اب ان ہی معاہدوں کا بنیادی اصول یہ مقرر ہوا کہ ''ارضی
ضمانت'' مہیا کی جائے ان حیلوں اور بہانوں کا مطلب اس کے سوا اور کیا
ہوسکتا تھا کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کا بنیادی اصول محض ایک بڑا
پرا انگریزی تسلط تھا اور کنٹنجنٹ کی حیثیت شکاری کے جال کے سوا کچھ نہ تھی
حکومت کے اس رویہ پر خود انڈین کونسل کے بعض ممتاز ارکان نے سختی کے ساتھ
نکتہ چینی کی اور سر جان کے (Sir john kaye) نے تو
یہاں تک لکھ دیا کہ جو طرز عمل گورنمنٹ اختیار کر رہی ہے اس نے ہندوستان
کی تمام بڑی بڑی ریاستوں کو یقین دلایا ہے کہ جو پالیسی ہم نے اپنی
کمزوری کے زمانہ میں اختیار کی تھی اسے اب ہم اپنی طاقتوری کے زمانہ
میں بدل رہے ہیں اور آخر میں اس نے لکھا تھا کہ:-

اس روش میں سلطنت کے لئے شدید خطرات مضمر ہیں جن کو میں اپنے
بیس سال کے تجربہ کی بناء پر نمایاں دیکھتا ہوں"[۱]

لیکن یہ سب تنبیہات بیکار تھیں حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد کی نگاہ میں ملک برار کی قیمت ان نصائح کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔

حکومت ہند کے اس انکاری جواب پر ۲۴ ر نومبر ۱۸۷۳ء کو سالار جنگ اور شمس الامراء نے ریزیڈنٹ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے حکومت کے جواب پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگرچہ سرکار نظام کسی جائز معاہدہ کی بناء پر کنٹیجنٹ رکھنے کی پابند نہیں ہے۔ تاہم وہ برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے اور صرف یہ چاہتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ باہمی اتفاق کے ساتھ اس امر پر غور کرے کہ "اراضی مقبوضہ کے بجائے نقد یا مالی ضمانت کے قبول کرنے میں کیا قباحت ہے۔

اس مراسلہ کو کلکتہ کے دفتر سیاسیات نے اس طرح نذر تغافل کر دیا جیسے کہ وہ وصول ہی نہیں ہوا اور ۱۹ ر مارچ ۱۸۷۴ء کو لارڈ سالسبری (وزیر ہند) سے یہ مختصر سا فیصلہ حاصل کر لیا کہ اضلاع کی بابت تفویض کو متعین کرنا تھا حکومت حیدرآباد کے اختیار میں نہیں ہے اور ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کا اصلی مقصد اراضی ضمانت حاصل کرنا تھا وزیر ہند کا یہ فیصلہ ۱۲ ر مئی ۱۸۷۴ء کو حکومت حیدرآباد کے پاس بھیج دیا گیا۔

اس کے جواب میں ۶ ر جولائی ۱۸۷۴ء کو سر سالار جنگ اور شمس الامراء نے

---

[۱] حیدرآباد افیرز جلد ۲ صفحہ ۳۸۳

ایک اور طویل مراسلہ بھیجا جو ۱۲۴ پیراگراف پر مشتمل تھا اور اس میں انہوں نے کنٹنجنٹ کی حقیقت، اس کے قرض کی اصلیت، اور ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی غیرقانونی نوعیت کو واضح کرنے کے بعد گورنمنٹ کو صاف طور پر مطلع کر دیا کہ محض برٹش گورنمنٹ کو خوش رکھنے کے لئے ہم اس کنٹنجنٹ کو برقرار رکھنے پر راضی تھے اور اس کے مصارف کے لئے ... ملین پونڈ کی رقم خطیر پیش کر رہے تھے لیکن اگر ہمارے اس فیاضانہ پیشکش کو رد کیا جاتا ہے تو ہمارے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ کرنل لو کے اس وعدہ پر بنیاد مطالبات کو قائم کریں جو ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے وقت انہوں نے حکومت ہند کی جانب سے کیا تھا کہ "تفویض صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک سرکار نظام کو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہیگی"۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کنٹنجنٹ کی ضرورت نہیں ہے آپ اسے برطرف کیجئے اور ہمارا ملک ہمیں واپس دیجئے۔ ل

یہ برٹش گورنمنٹ کے غاصبانہ حیلوں کا اصلی جواب تھا اور اس جواب کو صبر و سکون کے ساتھ سننا گورنمنٹ کی قوت ضبط سے باہر تھا۔ کلکتہ کے صیغہ خارجیہ نے اس مراسلہ کو دبا کر رکھ لیا وزیر ہند کو اس کی خبر تک نہ کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایک آخری جواب دیکر اس معاملہ کو ختم کر دیں۔ چنانچہ حکومت ہند کی درخواست پر لارڈ سالسبری نے ۱۷ جولائی ۱۸۷۶ء کو سر سالار جنگ کے مطالبات کا یہ قطعی جواب دیدیا کہ نہ ملک برار واپس کیا جائے گا اور نہ کنٹنجنٹ کے لئے مالی

ل حیدرآباد افیرز جلد ۳ صفحہ ۳۵۸ — ۳۵۹

ضمانت قبول کی جائے گی۔ یہ جواب سر سالار جنگ کے ۶ جولائی والے
خط کے بعد اس کے علم کے بغیر لکھا گیا تھا اور اس کے جواب میں بالکل
بے معنی تھا، لیکن رزیڈنٹ نے اس راز کو چھپانے کے لئے کہ "یہ قطعی فیصلہ"
۶ جولائی والے خط کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے۔ اسے ایک مہینہ سے
زیادہ عرصہ تک دبائے رکھا، اور ۳ اگست ۱۸۷۴ء کو امراء کے
حیدرآباد کی ایک دعوت کر کے اس میں سر سالار جنگ اور شمس الامراء کو
زبانی اس فیصلہ کا خلاصہ سنا دیا اور صاف الفاظ میں یہ بھی کہدیا
کہ اس فیصلہ کے بعد اب میں مسئلہ برار کے متعلق کوئی خط حکومت ہند
کو بھیجنے کے لئے وصول نہیں کروں گا۔[۵۱] سالار جنگ نے لارڈ سالسبری
کے مراسلہ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی خواہش کی مگر رزیڈنٹ نے
انکار کر دیا۔ دوسرے دن سالار جنگ نے سرکاری طور پر وزیر ہند
کے مراسلہ کی نقل طلب کی مگر اس کا بھی وہی جواب تھا جو زبانی
درخواست کا دیا جا چکا تھا۔ اس پر سر سالار جنگ نے ۲۹ ستمبر
۱۸۷۴ء کو ایک پر زور خط رزیڈنٹ کے نام لکھا جس میں انہوں نے
صاف صاف لکھدیا کہ

"اس جواب کا مطلب تو یہ ہے کہ سرے سے یہ بحث ہی کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے کہ
ہمارے دعاوی صحیح ہیں یا غلط اور انکی صحت و عدم صحت کا امتحان کئے بغیر
ان کو زبردستی دبا دینے کی کوشش کیجا رہی ہے ... سکرٹری آف اسٹیٹ کا

---

۵۱ حیدرآباد افیرز جلد ۲ صفحہ ۳۸۵ - ۳۸۸

فیصلہ جسکو آخری فیصلہ کہا جا رہا ہے ہمارے اصلی دعاوی اور دلائل کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے اور در اصل وہ ہمارے اس خط کا جواب ہے جو ۶ جولائی والے خط سے پہلے بھیجا گیا تھا۔"

رزیڈنٹ نے سر سالار جنگ کے اس خط کو حکومت ہند کے پاس بھیجنے سے انکار کر دیا اور ۳ اکتوبر کو اسے ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا کہ وائسرائے کی واضح ہدایات یہ ہیں کہ اب میں اس مسئلہ کے متعلق انہیں کوئی مراسلہ نہ بھیجوں۔ سر سالار جنگ نے ۱۵ اکتوبر کو پھر وہی خط رزیڈنٹ کے پاس بھیجا اور اسے لکھا کہ اس ریاست کی طرف سے جو فرائض مجھ پر اور میرے رفیق کار پر عائد ہوتے ہیں وہ ایک ایسے فیصلہ کو "آخری فیصلہ" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو ہمارے دعاوی کے حسن و قبح کو جانچے بغیر بلکہ نفس دعاوی کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہو۔ دوسرے دن رزیڈنٹ نے اس مسئلہ کو ایک نہایت خشمناک خط کے ساتھ سر سالار جنگ کے پاس واپس بھیج دیا جس میں لکھا تھا کہ:۔

"اس طرح کا پیہم اصرار پرائیوٹ اور سوشل تعلقات میں بھی ایک لمحہ کیلئے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور سرکاری معاملات میں تو اس سے کوئی اچھا نتیجہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا اس کا راست نتیجہ یہ ہوگا کہ ان عمدہ تعلقات پر برا اثر پڑے گا جو نظام کی نابالغی کے زمانہ میں حکومت ہند آپ سے اور امیر کبیر سے برقرار رکھنا چاہتی ہے۔"[۱]

---

[۱] حیدرآباد افیرز جلد ۳ صفحہ ۳۸۶

ایک طرف اس طریقہ سے سر سالار جنگ کا منہ بند کیا گیا اور دوسری طرف انگریزی حکومت نے اپنے اس قدیمی دوست کے اثر کو کم کرنے کے لئے سازش شروع کردی سر سالار جنگ کو برطانی حکومت کا دفادار دوست اس بناء پر سمجھا جاتا تھا کہ ان سے برطانی حکومت کو یہ امید تھی کہ وہ اپنے ملک اور اپنے آقا کی سلطنت سے غداری کرینگے مگر جب انہوں نے ایک نمک حلال خادم دولت کی حیثیت سے اپنے آقا کے جائز حقوق طلب کرنے شروع کئے تو وہی سالار جنگ سلطنت برطانیہ کے دشمن ہو گئے اور انگریزی حکومت نے ان کو اس طرح حیدرآباد کی حکومت سے نکال دینا چاہا جس طرح انگلی میں سے پھانس نکالدی جاتی ہے اس غرض کے لئے انگریزی رزیڈنٹ مسٹر سانڈرس نے رزیڈنسی میں امرائے حیدرآباد کو کھانے کی دعوت دی، اس میں ان لوگوں کو خاص طور پر بلایا جو سالار جنگ کے سخت مخالف تھے اور ان سے درخواست کی کہ وہ سالار جنگ اور شمس الامراء کو ان کی "نازیبا" حرکات سے باز رکھیں لیکن اس ریشہ دوانی میں مسٹر سانڈرس کو ناکامی ہوئی اور تقریباً تمام اکابر دولت نے اس کو یقین دلادیا کہ برار کے مسئلہ میں وہ سب مختار الملک اور ان کے رفیق کے موید ہیں۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف سالار جنگ نے اپنے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۴ء والے خط میں اشارہ کیا ہے کہ

"ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ اس ریاست کا کوئی وفادار خادم جو ہماری طرح اس دعوے کی قوت و صداقت کو محسوس کر چکا ہو۔ اور ہماری سی ذمہ داری کا حامل ہو اعلیٰ حضرت کے متعلق اپنے فرائض کا احساس

رکھنے کے باوجود ہمیں یہ مشورہ دے گا کہ اس دعوے سے دست بردار ہو جانا چاہئے [1]

سالار جنگ کو رزیڈنٹ کے رویہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ انگریزی حکومت ان سے سخت ناراض ہے مگر انہوں نے اس ناراضی کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور اپنے دعوے کو آگے بڑھانے کے لئے یہ غیر معمولی طریق کار اختیار کیا کہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو براہ راست وزیر ہند کے پاس اپنے کاغذات بھیجے اور انہیں اس سے بھی مطلع کر دیا کہ رزیڈنٹ اور حکومت ہند کے کس غیر معقول طرز عمل نے ان کو یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ لارڈ سالسبری کم از کم اتنے بد تمیز نہ تھے کہ مسٹر سانڈرس کی طرح ایک مقتدر ریاست کے وزیر اعظم کے منہ پر ان کاغذات کو کھینچ مارتے۔ انہوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر کاغذات رکھ لئے اور حکومت ہند کو ہدایت کی کہ وہ سر سالار جنگ کے دلائل کا جواب دے اور خصوصیت کے ساتھ اس استدلال کا جواب دے کہ "صرف معاہدہ کی بنیاد پر کنٹیجنٹ کا برقرار رکھنا یا اسے برطرف کر دینا نظام کی اپنی مرضی پر موقوف ہے"۔ لیکن حکومت ہند کے پاس دلائل کا کچھ جواب نہ تھا۔ وہ غیر متعلق کاغذات بھیج بھیج کر وزیر ہند کا وقت ضائع کرتی رہی اور اصل بنیادی نکات کا جواب دینے سے احتراز کرتی رہی یہاں تک کہ پورا ایک سال گذر گیا اور سالار جنگ کو وزیر ہند کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار سر سالار جنگ نے اس قضیہ کو طے کرنے کے لئے انگلستان جانے کا

---

[1] میمو آئیرز صفحہ ۳۵۹

زم کرلیا اور ۱۸۷۶ء میں وہ ملک کا انتظام اپنے رفیق کے سپرد کرکے خود یورپ
روانہ ہو گئے۔ حکومت ہند کے لئے یہ ایک مشکل صورت حال تھی سالار جنگ
کو سفر سے روکنا اس کے اختیار میں نہ تھا اور یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ وزیر ہند کے
ساتھ بالمشافہ گفتگو کرکے اس معاملہ کو طے کرلیں اس لئے اس نے اس مشکل کا
یہ حل تلاش کیا کہ سفر انگلستان میں سالار جنگ وزیر ہند سے برار کے
متعلق کوئی گفت و شنید نہ کریں۔ اور اس کے عوض رسمی مراسلت کے
دروازہ کو کھول دیا جائے جو ۱۸۷۴ء میں رزیڈنٹ نے بند کردیا تھا۔
چنانچہ اس سمجھوتہ کو قبول کرکے سر سالار جنگ نے انگلستان میں برار کے
متعلق کوئی گفت و شنید نہیں کی اور واپس آکر دسمبر ۱۸۷۶ء میں اپنے
دعاوی اور دلائل کے متعلق ایک مفصل بیان رزیڈنٹ کے پاس بھیجا
تاکہ وہ اسے حکومت ہند کے پاس بھیجدے لیکن رزیڈنٹ نے حسب
سابق اس میموریل کو وصول کرنے سے انکار کردیا۔

جنوری ۱۸۷۷ء کے دربار میں جب سالار جنگ نواب میر محبوب علیخاں
مرحوم کو لیکر دہلی گئے تو کلکتہ کے صیغہ خارجیہ سے حکم آیا کہ جب تک سالار جنگ
اور شمس الامراء دونوں اس مضمون کے اقرارنامہ پر دستخط نہ کردیں کہ وہ حکومت
آصفیہ پر دولت برطانیہ کی سیادت کو تسلیم کرتے ہیں اس وقت تک دربار
حیدرآباد کو شاہی اجتماع میں شامل نہ کیا جائے۔[1] اس کے ساتھ ہی

---

[1] سر سالار جنگ نے معاہدات کی بناء پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ دولت آصفیہ ایک آزاد و خود مختار ریاست ہے جس پر سلطنت برطانیہ کو حقوق سیادت حاصل نہیں ہیں بلکہ دونوں سلطنتوں کے تعلقات دوستانہ اتحاد پر مبنی ہیں سر سالار جنگ نے دولتین کے تعلقات میں بین الملی قانون کے نفاذ پر بھی زیادہ زور دیا تھا

ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ دولتین کے مابین نزاعی امور میں زیر ہند کے فیصلہ کو قطعی و آخری فیصلہ تسلیم کریں۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے سالار جنگ نے ان دونوں شرطوں کو منظور کر لیا تب جاکر انہیں دربار میں شرکت کی اجازت دی گئی اور ان کے اس میموریل کو قبول کیا گیا۔ جسے ڈسمبر میں واپس کر دیا گیا۔

اس کے چند مہینے بعد اپریل ۱۸۷۷ء میں شمس الامراء امیر کبیر کا انتقال ہو گیا۔ اور سالار جنگ کا زور توڑنے کے لئے انگریزی حکومت کو وہ موقع مل گیا جسکی وہ منتظر تھی۔ سالار جنگ کی خواہش تھی کہ ایجنسی تنہا ان کے ساتھ مخصوص رہے اور سلطنت کے چاروں معین المہاموں کی ایک اگزکیٹو کونسل بنادی جائے لیکن رزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ اور وائسرائے لارڈ لٹن کے درمیان کچھ اور ساز باز ہو رہا تھا۔ کئی مہینے تک مواد تیار ہوتا رہا اور آخر ۲۰ اگسٹ ۱۸۷۷ء کو سر رچرڈ میڈ نے سالار جنگ کو اطلاع دی کہ وائسرائے نے نواب وقار الامراء کو شریک مختار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سالار جنگ اور وقار الامراء میں شدید ذاتی عداوت تھی اور وہ ان سے ملکر کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس فیصلہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اس پر سر رچرڈ میڈ سیدھے وائسرائے کے پاس پہنچے اور وہاں سے واپس آکر انہوں نے ایک نیم سرکاری ذریعہ سے سالار جنگ کو مطلع کیا کہ وائسرائے سے پوری اجازت لے لی گئی ہے اب اگر آپ نے ان کے آخری و قطعی فیصلہ کو قبول نہ کیا تو آپ کو

گرفتار کر کے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ مدراس بھیجدیا جائے گا۔[۵۰]
اس دھمکی کے بعد مزید مقاومت کرنا سالار جنگ کے لئے ناممکن تھا۔ مجبوراً
انہوں نے "فیصلہ" کے آگے سر جھکا دیا اور ۲۹ ستمبر ۱۸۶۷ء کو وقار الامرا کو
شریک مختار بنا دیا گیا۔

یہ وہی سالار جنگ تھے جن کے متعلق ۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے مراسلہ
میں لارڈ اسٹینلے نے بحیثیت وزیر ہند یہ حکم دیا تھا کہ ان کا نام غدر کے
وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا جائے اور یہ وہی سالار جنگ تھے
جن کے متعلق ۲۹ مارچ ۱۸۵۸ء کے ایک مراسلہ میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ
کرنل ڈیوڈسن نے لکھا تھا کہ:۔

"نظام کے وزیر نے جس بے دریغ مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ حکومت
انگلیشیہ کی اعانت کی ہے وہ تعریف و توصیف سے بالاتر ہے .....
ہر خطرہ کے وقت میں ہماری علانیہ امداد کا تہیہ کر لینے سے وہ مسلمانوں
میں سخت غیر مقبول بلکہ قریب قریب خارج از ملت سے ہو گئے تھے
مگر نہ کسی قسم کی ملامتیں اور دھمکیاں اور نہ التجائیں و استدعائیں
ان کو اس سچی وفاداری کے راستہ سے ہٹا سکیں جو انہوں نے اول
دن سے اختیار کیا تھا۔ بیسیوں مرتبہ ان کے قتل کی سازشیں
کی گئیں اور مجھے یقین ہے کہ خود ان کو ان سازشوں کا علم تھا مگر
نہ تو جان کا خوف ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکا اور نہ ان اطلاعات نے

۵۰۔ حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۳۹۲

انہیں متزلزل کیا جو شمال مغرب سے ہماری شکستوں کے متعلق پیہم موصول
ہو رہی تھیں۔ جب کبھی میں نے ان سے مدد طلب کی تو انہوں نے اسی
استقلال اور یکدلی کے ساتھ اسکو پورا کیا اور حکومت نے نظام کے وسائل
جہاں تک ان کے اختیار میں تھے میرے لئے وقف کر دیے۔"

اس وفاداروں کے وفادار اور سرگرم مددگار کو آج گرفتاری اور جلاوطنی
کی دھمکی دی جارہی تھی، اس پر الزام لگایا جارہا تھا کہ وہ وہابیوں کی سازش
میں شریک ہے! افغانستان سے سازباز کررہا ہے، بغاوت کے لئے فوج
تیار کررہا ہے خفیہ اسلحہ سازی کے سامان فراہم کررہا ہے انگریزی اخبارات
کے کالم اس پر طعن و تشنیع کے لئے وقف تھے۔ اور خود وائسرائے
لارڈ لٹن کو بھی یہ کہنے میں تامل نہ تھا کہ اس کے عہد حکومت میں سالار جنگ
سب سے بڑا "خطرہ" تھا۔[1] اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سالار جنگ نے
اپنے آقا کے حق نمک کو ادا کرنے کے لئے انگریزی حکومت سے وہ ملک
واپس طلب کیا تھا جسے وہ ہضم کر چکی تھی۔

چند الفاظ نواب وقار الامراء بہادر کے متعلق بھی کہنے ضروری ہیں
جن کو اس موقع پر شریک مختار کے منصب کے لئے سب سے زیادہ "موزوں"
اور "قابل" شخص قرار دیا جارہا تھا۔ یہ شمس الامراء امیر کبیر اول کے صاحبزادے
تھے۔ ۱۸۵۹ء میں جب کرنل ڈیوڈسن اور نواب سالار جنگ پر قاتلانہ
حملہ ہوا تھا تو ان پر شبہ کیا گیا تھا کہ قاتل کی پشت پر ان کا ہاتھ ہے

۱؎۔ تھارنٹن نے سر رچرڈ میڈ کی سوانح عمری میں لٹن کے اس خط کا حوالہ دیا ہے۔

۱۸۶۱ء میں ایک اور سازش کے سلسلہ میں ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا تھا اور سرکاری درباروں میں ان کا داخلہ تک بند کر دیا گیا تھا۔ ۷۰-۱۸۶۹ء کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ میں مسٹر سانڈرس رزیڈنٹ ان کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"۸ سال پہلے امیر کبیر کے بھائی نواب وقار الامراء ایک ایسی سازش میں شریک ہونے کے مجرم قرار دیئے گئے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود اپنے لئے وزارت کا منصب حاصل کریں۔ اس لئے حکومت عالیہ کے احکام کے ماتحت ان کو ہر ایسے پبلک اجتماع کے موقع پر (جس سے خود نظام کا دربار بھی مستثنیٰ نہ تھا) شریک ہونے سے روک دیا گیا جس میں برطانی حکومت کا نمائندہ موجود ہو۔ یہ حکم سزا سیاسی اعتبار سے کامل موت کا ہم معنیٰ تھا۔" ۵۱

چار پانچ سال پہلے تک جس شخص پر "سیاسی موت" طاری رکھی گئی تھی اور جس کا سرکاری اجتماعات میں داخلہ تک بند تھا۔ اس پر اب عنایات شاہانہ و الطاف خسروانہ کی بارش ہو رہی تھی اور اس کے متعلق برطانی رزیڈنٹ امرائے حیدرآباد کے بھرے مجمع میں کہہ رہا تھا کہ "وہ ہمیشہ سے برٹش گورنمنٹ اور ہز ہائی نس نظام کی حکومت کے درمیان دوستانہ تعلقات رکھنے کا خواہشمند رہا ہے۔"

اس طرح سالار جنگ کو بے بس کرنے کے بعد ۲۸ مارچ ۱۸۶۸ء کو

---

۵۱ حیدرآباد آفیرز جلد ۲ صفحہ ۳۶۰

لارڈ سالسبری کی جانب سے سالار جنگ کے اس میموریل کا جواب بھجوایا گیا جو انہوں نے جون ۱۸۷۷ء کو بھیجا تھا۔ اس جواب میں کنٹینجنٹ کے وجود اور اس کی برطرفی کے مسئلہ کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا گیا کرنل لو کی معرفت سرکار نظام سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس سے بھی کوئی بحث نہیں کی گئی اور تمام دلائل کا صرف یہ جواب دیا گیا کہ :-

"اس وقت ان اسباب اور محرکات کے متعلق تحقیقات کرنا جو ۱۸۵۳ء کا معاہدہ کرنے والوں کے لئے باعث تحریک ہوئے تھے، فضول ہے یہ واقعہ کہ اس پر دستخط کئے گئے اور وہ ان لوگوں کیلئے واجب التعمیل ہے جنہوں نے اس پر دستخط کئے، صرف یہی ایک ایسا مادی واقعہ ہے جس سے ہز مجسٹی حکومت کو ایک جانب اور ہز ہائی نس کی حکومت کو دوسری جانب سروکار رکھنا چاہیئے"

مگر اس کھلی ہوئی صداقت کشی کے باوجود لارڈ سالسبری سر سالار جنگ کے مدلل دعوے کو کلیتہً رد کرنے کی جراءت نہ کر سکا اور اس نے صرف اس عذر کی بناء پر اس کو رد کیا کہ "اس قسم کے مسائل کو نظام کی جانب سے چھیڑنا ایسی حالت میں کچھ نامناسب سا ہے جب کہ خود نظام ابھی نابالغ ہیں"۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ اگر ہز ہائی نس امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کریں گے کہ دولتین کے تمام ان معاملات پر جو از روئے معاہدہ طے ہوئے ہیں ایک عام نظرثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس کی اس درخواست پر غور کرے گی"۔

اگرچہ یہ عذر بھی نہایت غیر معقول تھا جب والی ملک کی نابالغی کے

زمانہ میں مختار ریاست تمام معاملات کا نگران ہوتا ہے تو اس کی جانب سے سیاسی مسائل کو طے کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ خود تاریخ انگلستان میں ریجنسی کے ایسے اہم معاملات طے کرنے کی مثالیں نادر الوجود نہیں ہیں، ایڈورڈ ششم کی نابالغی کے زمانہ میں نہایت اہم قانون کلب کی تدوین اور ۴ لاکھ کراؤن کے عوض بولون (Bologne) کی واپسی ہنری سوم کی نابالغی کے زمانہ میں میگنا کارٹا کی توثیق اور آخری ریجنسی میں ۱۸۱۴ء کے معاہدہ پیرس کے ذریعے مالٹا، مارشیس، سیلون اور جزائر غرب الہند کا انگریزوں کے ہاتھ آنا یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔ جب ایسے ایسے معاملات ریجنسی کے دور حکومت میں طے ہو سکتے تھے تو حیدرآباد کی ریجنسی سے استرداد برار کے مسئلہ کو طے کرنا کیوں نامناسب تھا؟ تاہم یہی غنیمت ہے کہ لارڈ سالسبری نے لارڈ نارتھ بروک کی طرح گفت و شنید کا دروازہ بالکل بند نہیں کیا اور نظام کے لئے اس کی گنجائش رکھی کہ اس دروازہ کو کھٹکھٹا سکیں۔

نواب میر محبوب علیخاں مرحوم

نواب سالار جنگ مرحوم سالسبری کا یہ جواب سنکر اس امید پر خاموش ہو گئے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو

پہنچنے میں بھی کچھ زیادہ مدت نہ تھی، ان کو خیال تھا کہ جب حضور تخت
نشین ہوں گے تو انگریزی حکومت کے لئے نابالغی کے عذر کی بھی
گنجایش نہ رہے گی۔ لیکن قدرت انگریزی حکومت کے لیے پیہم کامیابی
کے سامان مہیا کئے جا رہی تھی۔ ابھی اعلحضرت مرحوم کی تخت نشینی
میں ایک سال باقی تھا کہ ۱۸۸۳ء میں نواب سالار جنگ کا انتقال
ہو گیا اور انگریزی حکومت کے کارندے اس کوشش میں لگ گئے کہ
نواب کی تخت نشینی سے پہلے برار کے قضیہ کا ہمیشہ کے لئے قابل
اطمینان فیصلہ کر لیا جائے۔ حیدرآباد کے چالاک رزیڈنٹ مسٹر
کارڈری (Cordery) نے بعض نمک حرام امراء سے
ساز باز شروع کر دیا اور ایک عہد نامہ کا مسودہ بھی طیار کر لیا۔
جس پر نوجوان بادشاہ سے دستخط لینے کا ارادہ تھا۔ بلنٹ جو اس
زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے حیدرآباد آیا تھا
اپنی مشہور کتاب ہندوستان بعہد رپن (Ripon)
میں اس سازش کے متعلق لکھتا ہے :۔

"ہم نے نہایت آزادی کے ساتھ سیاسی حالت پر گفتگو کی جو
یہ تھی چند ہفتوں میں نظام سن بلوغ کو پہنچ جائیں گے اس کیلئے رزیڈنٹ ابھی
کی طرف سے یہ کوشش کیجا رہی ہے کہ ان سے ایک معاہدہ پر دستخط
حاصل کئے جائیں جس میں نظام اور حکومت ہند کے درمیان موجودہ
اتحاد کی تجدید کے ساتھ ایک دفعہ اس قسم کی بھی ہے جو تمام پچھلے معاہدات کو

منسوخ کردیتی ہے۔ اور اس طرح صوبۂ برار مستقل طور پر انگریزوں کے
ہاتھ آجاتا ہے .... سید حسین (نواب عماد الملک مرحوم)
یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ رزیڈنسی میں تیار رکھا ہے
ان کو اسکی ایک نقل یا اس کا خلاصہ دکھایا گیا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ
جب نظام سن بلوغ کو پہنچیں گے تو یا تو اس معاہدہ کو انکی تخت نشینی کیلئے
لازمی شرط کے طور پر پیش کیا جائے گا یا اس سے پہلے ہی اس پر پیشکار کے
دستخط لے لیئے جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کارروائی قانون کے مطابق
کی جاسکتی ہے کیونکہ کونسل آف ریجنسی کو شاہی اختیارات حاصل ہیں
اور کونسل جن لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک تو ضعیف العمر اور غیر
مستقل پیشکار ہیں دوسرے خود تخت کے امیدوار خورشید جاہ
ہیں اور یہ دونوں رزیڈنسی کے اثر میں ہیں تیسرے بشیر الدولہ ہیں
جن کا کوئی خاص رنگ یا مضبوط کیرکٹر نہیں ہے۔ رہے نوجوان
سالارجنگ (یعنی میر لائق علیخاں ابن سالارجنگ اول) سو وہ
کونسل میں محض سکرٹری کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے
کونسل کے فیصلوں میں ان کی آواز کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔"

بہت ممکن تھا کہ اس سازش کو کسی نتیجہ خیز حد تک پہنچا دیا جاتا،
مگر اس وقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ رپن تھا جو مارکوئس بروک
اور لٹن سے مختلف ذہنیت کا آدمی تھا اس لئے اسکے ہاتھ زور روشن میں یہ بے ایمانی
نہ کی جاسکی اور برار کا مسئلہ مزید بیس سال کے لئے ملتوی ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت مرحوم نے مسند آرائے سلطنت ہونے کے بعد استرداد برار کے مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور انگریزی حکومت کے ساتھ غایت درجہ کی وفاداری کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے افغانستان اور مصر کے مسائل میں اپنی فوجی امداد انگریزی حکومت کو پیش کی ۱۸۸۷ء میں جبکہ روس کا خطرہ بڑھ رہا تھا تو مرحوم نے سرحد کی حفاظت کے لئے ۲۰ لاکھ روپیہ اور ایک کثیر فوج سے حکومت کی مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو میں بذات خود میدان جنگ میں جاؤں گا۔

اعلیٰ حضرت کی اسی پیشکش سے امپیریل سروس ٹروپس کا تخیل پیدا ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے امپیریل گورنمنٹ کی مدد کے لئے ۸۰۰ سوار رسالہ ایک رسالہ قائم کیا اور ڈسمبر ۱۹۰۱ء میں برٹش گورنمنٹ سے یہ سمجھوتہ کیا کہ جب کبھی میدان جنگ میں انکی فوج جائے گی تو وہ انگریزی افواج کے قائد اعلیٰ کے ماتحت رہے گی۔

اس وفاداری اور استرداد برار کے حق سے بے اعتنائی کا یہ انعام ملا کہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے خود مسئلہ برار کو چھیڑا اور انہی جائز طریقوں سے جو پہلے ڈلہوزی اختیار کر چکا تھا، برار کا دوامی پٹہ حاصل کر لیا یہ کارروائی جس طریقہ سے عمل میں لائی گئی اسکی صحیح کیفیت ظاہر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ۵۰ سال پہلے کے واقعات سے اس کا سلسلہ از سر نو جوڑا جائے۔

لارڈ کرزن کا دوامی پٹہ

۱۸۵۳ء جب تفویض برار کے معاہدہ کی گفتگو کا آغاز کیا گیا تھا تو

ابتداءً حکومت برطانیہ کا مطالبہ یہ تھا کہ برار کو ہمیشہ کے لئے اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کو لارڈ ڈلہوزی نے مجوزہ معاہدہ کا جو مسودہ کرنل لو کے نام بھیجا تھا اسکی دفعہ ۶ کے الفاظ یہ تھے۔

”مذکورہ بالا حیدر آباد کنٹیجنٹ کے مصارف کی باقاعدہ ادائیگی کے لئے ہز ہائی نس نظام اس معاہدہ کے ذریعہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو دوامی طور پر وہ تمام اضلاع سپرد اور تفویض کرتے ہیں جن کے نام اس معاہدہ سے منسلک ضمیمہ میں دیئے گئے ہیں۔

جب یہ مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے زیادہ جس چیز کی مخالفت کی وہ یہی ”دوامی تفویض“ تھی اس کے خلاف انکی ناراضی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ انگریزی سلطنت کی شدید دھمکیوں کے باوجود اس کو قبول کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہے اور انگریزی رزیڈنٹ کو یقین ہو گیا کہ اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو اعلیحضرت معاہدہ ہرگز نہیں کریں گے تب اس نے ”دوامی طور پر“ کے الفاظ نکالدیئے اور اس شرط پر معاہدہ کیا کہ جب تک انہیں کنٹیجنٹ کی ضرورت رہے گی اس وقت تک برار انگریزی انتظام میں رہیگا۔ کرنل لو اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ :-

میں نے جب دیکھا کہ لفظ ”دواماً“ (Imperpetuity) سے نظام کی ناراضی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے اس لفظ پر زیادہ اصرار کیا تو تمام گفت و شنید ہی ناکام ہو جائے گی تو میں نے یہ اعلان کیا کہ اس اسکیم کا یہ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق میری حکومت نے

مجھے آزادی دی ہے کہ اگر ضروری ہو تو اسے بدل دوں اور میں نے باضابطہ
(Formally) یہ اعلان کر دیا کہ اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹیجنٹ
کی پرورش کی غرض سے محض اس وقت تک کے لئے تفویض کئے جا سکتے ہیں جب
تک انہیں اس کی دیسی کنٹیجنٹ کی ضرورت ہے اور مزید برآں میں نے کہا کہ
اگر ہز ہائی نس مجھ سے یہ خواہش ظاہر کریں کہ وہ اس کی فوج کی ضرورت نہیں
رکھتے تو گورنر جنرل اسکو بتدریج تخفیف کر کے کلیتہً برطرف کر دینگے ..... اور
جب یہ ساری فوج توڑ دی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی
تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں۔[1]

اس طرح تفویض کے محض عارضی ہونے کا اطمینان دلا کر ۱۸۵۳ء میں برار پر
قبضہ حاصل کیا گیا تھا۔ جب یہ ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا تو سات سال بعد اس
مقصد کی جانب دوسرا قدم بڑھایا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ کی گورنمنٹ نے نواب
افضل الدولہ سے خواہش ظاہر کی وہ ملک برار کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے کی اجازت
دیدیں اور ملک کی آمدنی میں سے منافع کا مطالبہ ترک کر دیں۔ سر سالار جنگ نے اتنا
اعتراض کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو تفویض برار کی بالکل وہی حیثیت ہو جائیگی جو [illegible]
کے علاقہ کی ہے۔ اور اس طرح "الحاق" اور "تفویض" میں کچھ فرق نہ رہیگا۔ اس
معقول اعتراض کا حکومت ہند کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے اس نے تحریری
اطلاع سے کام نکالنے کی کوشش کی اور سرکار نظام کو ریزیڈنٹ کی معرفت لکھا گیا۔
گورنر جنرل باجلاس کونسل ان اضلاع کو کلیتہً نظام کے مقروضات کا ایک

---

[1] Hyderabad affairs Vol. II P. 608.

حصہ سمجھتے ہوئے اور برٹش گورنمنٹ کے کسی ضلع میں ان کو ضم کرنے سے
احتراز کرتے ہوئے محض انتظامی آسانی اور خرچ کی کفایت کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ
انہیں کمشنر ناگپور کی نگرانی میں دیدیں اس طریقہ سے جوڈیشل کمشنر کا عہدہ
توڑ دیا جاسکے گا۔ اضلاع مفوضہ کے انتظام کے لئے دوسرا عملہ جو حیدرآباد میں
رکھا جاتا ہے اسے بھی موقوف کیا جاسکیگا اور بہت سی تخفیف مصارف سے
متعلق اصلاحیں عمل میں لائی جاسکینگی۔[1]

لیکن اس اطلاع کا بھی حضور نظام پر کچھ اثر نہ ہوا اور جب ان پر زیادہ
زور ڈالا گیا تو انہوں نے صاف کہا کہ تم ہمیں ایسے امور کو قبول کرنے پر مجبور کرتے ہو
جن کو ہم نہیں چاہتے، اور ملکہ معظمہ کے اعلان کے باوجود تمہاری حکومت ہمارے
ساتھ پھر وہی جابرانہ سلوک کرنا چاہتی ہے جسکی بدولت اس سے پہلے ہم سالہا
سال تک مالی مشکلات میں مبتلا رہے ہیں۔[2] انگریزی حکومت تہیہ کر چکی تھی کہ
سرجان میلکم کی پرانی اسکیم کے مطابق برار، ناگپور، ساگر اور نربدا کے علاقوں کو
ملا کر ایک صوبہ متوسط قائم کردے اور یہاں طے ہوچکا تھا کہ اس جدید صوبہ کا
پہلا لفٹننٹ گورنر حکومت ہند کے معتمد امور خارجہ مسٹر سیسل بیڈن کو بنایا جائے
مگر جب دیکھا کہ نظام اس نقطہ پر اتنی سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں ”تخویف
و ترہیب کے بغیر اپنی مرضی و خوشی سے اسکو نہ چھوڑیں گے“[3] حکومت ہند نے

---

[1] مسٹر بنگ ڈپٹی سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۹۸۸ ۳
صیغہ خارجہ [2] کرنل ڈیوڈسن کا مراسلہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۰ء نمبر ۱۹ صیغہ خارجہ۔
[3] ایضاً

کسی دوسری فرصت کے لئے اس ارادہ کو ملتوی کردیا اور بلاواسطہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بجائے بالواسطہ حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔

یہ بالواسطہ حصول مقصد کا طریقہ یہ تھا کہ آمد و خرچ کا حساب پیش کرنے کی شرط جو سنہ ۱۸۵۳ء میں نکالی گئی تھی، اڑادی گئی اور حکومت کے لئے اس حق کو محفوظ کرلیا گیا کہ وہ برار کی آمدنی میں سے جتنا چاہے خرچ کرے۔ چنانچہ ۱۹؍ نومبر سنہ ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کے صیغہ خارجیہ کی جانب سے یہ تصریح کردی گئی کہ:-

گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات پر راضی ہیں کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے نظم و نسق کے مصارف اور وہ اخراجات جو اس پر عائد کئے گئے ہیں وضع کرکے جو کچھ رقم بچے اور سرکار نظام کو ادا کردے مگر یہ رضامندی صرف اس مفاہمت پر ہے کہ اس مد میں برٹش گورنمنٹ کے لئے پھیلاؤ کی زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھی جائے گی اور ان اضلاع کے نظم و نسق کے لئے تمام وہ اخراجات جنہیں گورنمنٹ کے عہدہ دار مناسب اور ضروری سمجھیں گے۔ انہیں قبل اس کے کہ کوئی فاضل باقی سرکار کو ادا کیا جائے اس میں وضع کرلیا جائے گا اور سرکار نظام کو اس اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا اور اگر ایک سال آمدنی سے خرچ زیادہ ہونے کے باعث گھاٹا آیا تو اسے دوسرے سال کی بچت سے پورا کرلیا جائے گا۔[1]

اس شرط کو سرکار نظام نے طوعاً کرہاً منظور کرلیا اور سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ

---

[1] مسٹر ٹینک کا مراسلہ نمبر ۲/۶ ۵۵ صیغہ خارجیہ

چہارم میں یہ بات طے کرلی گئی کہ :-

اخراجات کی مقدار کلیتہً برٹش گورنمنٹ کے اختیار تمیزی پر منحصر رہیگی [1]

اس شرط کو منظور کرلینے کے بعد یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ برار کے خزانہ سے جہانتک ممکن ہوگا نظام کو بچت کا ایک پیسہ نہیں دیا جائے گا۔ معاہدہ طے ہوتے ہی دوسرے سال سے کنٹنجنٹ کے اخراجات تقریباً دوگنے کردیئے گئے۔ ڈلہوزی کے زمانہ میں سے صرف ۳۲ لاکھ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے اب ان کو بڑھا کر ۴۱ لاکھ کردیا گیا (حالانکہ سنہ ۱۸۵۳ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے درمیان ۲۴ لاکھ سے زیادہ نہ تھے) نظم و نسق کے مصارف ۲۵ فی صدی سے بڑھکر ۳۳ فی صدی ہوئے پھر ۵۰ فیصدی اور آخر ۵۶ فی صدی تک ان کو پہنچا دیا گیا۔ ۱۷۰۰۰ مربع میل رقبہ اور ۲۰۹۰۰۰۰ کی آبادی رکھنے والے صوبہ کا عملہ اس زمانہ میں صوبہ مدراس کے برابر تھا جس کی آبادی ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی اور جس کے حدود ڈیڑھ لاکھ مربع میل پر پھیلے تھے اس چھوٹے سے صوبہ کو ۶ اضلاع پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ضلع میں ایک کلکٹر ۵ مددگار اور ۲۰ زائد مددگار رکھے گئے تھے اور اسی نسبت سے دوسرے محکموں میں بھی انتہا درجہ کی دریا دلی کے ساتھ فضول عملہ رکھا گیا تھا جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یار وفادار کو اس وقت تک ایک پیسہ نہ ملے جبتک وہ اپنے ملک کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے پر راضی نہ ہوجائے۔

برار کی آمدنی سنہ ۱۸۶۰ء تک ۳۲ لاکھ تھی دوسرے سال ۴۰ لاکھ ہوگئی

[1] Aitchison Vol. IX P. 105.

۱۸۷۰ء میں ۷۳ لاکھ ہوئی اور ۱۸۹۵ء میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی لیکن اتنی حیرت انگیز توفیر کے باوجود ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۲ء تک جو بچت کی رقم سرکار نظام کے لئے نکالی گئی اس کا اوسط ۹ لاکھ سے زیادہ کبھی نہ بڑھا بلکہ ۱۸۹۲ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان تو صرف ۷ لاکھ کا اوسط رہا اور ۱۸۹۸ء میں ایک پائی کی بھی بچت نہ نکالی گئی۔ پھر مزید یہ کہ برار کی آمدنی میں ۵۰ لاکھ کی ایک رقم خطیر اتفاقی ضروریات کے لئے محفوظ بھی کر لی گئی حالانکہ اسے ملک کے اصل مالک کے خزانہ میں پہنچنا چاہئے تھا۔

۱۹۰۲ء میں جب برار کی نئی جمعبندی ہونے والی تھی اور یہ امید تھی کہ اس میں اس صوبہ کی آمدنی ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ہو جائیگی تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ کنٹنجنٹ کے مصارف ۳۵ لاکھ اور نظم و نسق کے مصارف ۵۰ لاکھ رکھ کر سرکار نظام کیلئے ۳۱ لاکھ کی بچت نکالی جائے لیکن اس تجویز کو انگریزی حکومت کے سرکاری حلقوں میں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور یہ تجویز جہاں سے نکلی تھی وہیں دفن ہو گئی۔

ان پیہم حق تلفیوں پر جب سرکار نظام کی طرف سے شکایت کی گئی تو مئی ۱۸۹۹ء لارڈ جارج ہیملٹن (وزیر ہند) نے اس طرف توجہ کی اور حکومت ہند کو لکھا کہ

"میں اس صورت حال کو قابل اطمینان نہیں سمجھ سکتا اور یور اکسلنسی کی حکومت کی خاص توجہ کے لئے اس معاملہ کو بدیں غرض پیش کرتا ہوں کہ کفایت شعاری کی ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو برار کی مالی پوزیشن کو ایسی بنیاد پر قائم کرنے کے لئے قابل عمل پائی جائیں جس سے

نظام کو ادا کرنے کے لئے مخارج پر مداخل کی کافی زیادتی نکل آئے۔
اس کے جواب میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ نے ایک طویل رپورٹ بھیجی جس کا خلاصہ یہ ہے :-

"دونوں حکومتوں کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ ان شرائط پر ازسرنو غور کیا جائے جن کے ماتحت برار کا موجودہ انتظام ہو رہا ہے تاکہ ہز ہائی نس نظام کو ان اضلاع سے جو ہماری تفویض میں ہیں اس سے زیادہ باقاعدہ اور معین آمدنی دی جائے جتنی موجودہ معاہدہ کے ماتحت دیجانی ممکن ہے اس معاملہ میں معاہدہ کی شرائط کی پوری پابندی کی گئی ہے مگر معاہدہ خود ہی ایسا ہے کہ نظم ونسق میں کسی کفایت شعاری کا موقع نہیں دیتا اور زیادہ بچت نکالنے سے روکتا ہے۔ اب تک بڑی سے بڑی رقم جو کسی ایک سال میں ہز ہائی نس کو دی گئی ہے وہ ۷۸-۱۸۷۷ء میں ۱۹۷۳۰۰۰ کی رقم تھی چند سال ایسے بھی گذرے ہیں جن میں کوئی بچت ہی نہیں نکلی۔ اوسطاً ۱۸۶۱ء سے ۱۹۰۱ء تک قریب قریب ۹ لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم سرکار نظام کو دی گئی ہے۔ زیادہ قریبی زمانہ میں تو ایسے حالات پیش آگئے ہیں کہ آئندہ چند سال کے لئے بچت نکالنے کا موقع ہی نہیں رہا بہرحال صاف ظاہر ہے کہ چالیس سال سے برار ریاست حیدرآباد کے لئے محض ایک غیر معین اور گھٹتی ہوئی آمدنی کا ذریعہ رہا ہے اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس صورت حال میں کسی قسم کا تغیر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر نظام ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کو بدل کر حکومت ہند کی مرضی کے مطابق دوسرے انتظام کرنے پر راضی نہ ہوئے تو جس طرح چالیس سال سے ان کو غیر معین اور گھٹتی بڑھتی" آمدنی ملتی رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی بس ایسی ہی ملتی رہیگی بلکہ آئندہ اتنی بھی ملنے کی امید نہیں ہے! ایک طرف قحط کے باعث سرکار نظام کی مالی حالت حد درجہ خراب ہو رہی تھی، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی نے اسکو سخت پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا اور اسے ۲ کروڑ کے قریب قرض لینا پڑا تھا دوسری طرف وہ پرانا دوست جسکی مدد کے لئے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم نے ۶۰ لاکھ روپیہ کی رقم اپنی رعایا کی اور بوقت ضرورت خود اپنی جسمانی خدمات کے ساتھ پیش کی تھی، ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں تمہارے ملک کے سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے تم کو اس شدید ضرورت کے موقع پر اس وقت تک ایک پیسہ نہ دوں گا جب تک تم میری ان شرائط کو نہ مان لوگے جنہیں تمہارے والد نے چالیس سال پہلے نامنظور کیا تھا اس سے زیادہ احسان شناسی شرافت اور آدمیت اور کیا ہو سکتی تھی؟ پہلے یہی اخلاقی فضیلت دوست پر فوجی حملہ کی دھمکی کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ اب زمانہ بدل چکا تھا اس لئے وہی چیز اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ دوست کو شدید مالی مشکلات میں مبتلا کر کے اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا گیا۔

یہ نازک حالت تھی جس میں برار کی آمدنی کے مسئلہ کو طے کرنے کیلئے سرکار نظام نے سنہ ۱۹۰۱ء میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا جو چند مہینہ تک

چلتا رہا۔ آخر ۱۹۰۲ء کے اوائل میں لارڈ کرزن نے خود حیدرآباد جاکر اسکو طے کرنے کا قصد کیا اور ۳۰ مارچ کو اعلیٰ حضرت مرحوم سے وہ تاریخی ملاقات کی جس کا نتیجہ ایک سمجھوتہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سفر کا مقصد خود لارڈ کرزن ہی نے اپنے ۱۴ نومبر ۱۹۰۲ء کے ایک مراسلہ میں اس طرح بیان کیا ہے :-

امتداد زمانہ سے یہ (۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے) طے کئے ہوئے معاملات غیر مناسب بھی ہوگئے تھے اور فرسودہ بھی اور اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی نزاعات بھی پیدا کرتے رہتے تھے ...... گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب موجودالوقت انتظام کی خرابی یہ تھی کہ معاہدات کے ماتحت صوبہ کا فوجی و دیوانی نظم و نسق ناقص اور مسرفانہ تھا اور ہزہائی نس کی جانب تفریق کی خواہش فاضل باقیات کی اس غیر معین اور ناپائدار حالت سے پیدا ہوئی تھی جسکی بے ضابطگی اور پراگندگی ریاست کے مالیات میں بے ثباتی کا افسوسناک عنصر پیدا کر رہی تھی۔"

آگے چل کر لارڈ کرزن کہتا ہے کہ اس عقدہ کا حل اس نے یہ سوچا تھا کہ ان انتظامی دشواریوں کو ایسے طریقے سے دور کیا جائے جس سے "ہزہائی نس نظام کو ان کی مملکت کے اس خطہ سے ایک معین آمدنی حاصل ہوسکے اور برار کی ۲۸ لاکھ آبادی کے لئے ان حالات اور مراتب کے استمرار کا اطمینان کرلیا جائے جن سے وہ خوشحالی کے بلند درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔" ان حالات و مراتب کا استمرار دوسرے الفاظ میں برٹش گورنمنٹ

قبضہ و تصرف کا استمرار تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لارڈ کرزن نے گفت و شنید کا آغاز کیا اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ برٹش گورنمنٹ کا برار کا دوامی پٹہ اس شرط پر دیدیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا انتظام کرے اور اسکے عوض ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ مستقل خراج سرکار کو دے اول اول اعلیحضرت مرحوم نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کیا اور برار کی واپسی پر زور دیا۔ مگر جب لارڈ کرزن نے انہیں یقین دلادیا کہ برار ہرگز واپس نہ کیا جائیگا اور ۱۸۶۰ء کی شرائط پر قائم رہنے سے وہ برار کی آمدنی کا بھی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے تو مجبوراً انہوں نے لارڈ کرزن کی اس تجویز کو قبول کرلیا اور ۵ نومبر ۱۹۰۲ء کو فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ جس کی دفعات حسب ذیل تھیں۔

دفعہ اول :- ہز ہائی نس نظام جن کے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ پر از سر نو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان اضلاع کو دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کے حوالہ کرتے ہیں جس کے عوض برٹش گورنمنٹ ان کو ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا معین اور مستقل خراج ادا کریگی۔

دفعہ دوم ۔ حکومت برطانیہ اضلاع مفوضہ میں اس مکمل اور غیر مشترک قبضہ و اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے جو اسے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے حاصل ہیں اس امر میں آزاد ہو گی کہ بلا لحاظ ان معاہدات کی خلاف ورزی کے اضلاع مفوضہ کا ایسے طریقے سے انتظام کرے

جیسے وہ پسند کرتی ہو نیز یہ کہ ان افواج کو جو حیدرآباد کنٹیجنٹ کے نام سے قائم ہیں جس طرح مناسب سمجھے از سر نو تقسیم کرے تخفیف کرے تنظیم کرے اور نگرانی کرے البتہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۳ میں ہز ہائی نس کے مقبوضات کی حفاظت کا جو اقرار اس نے کیا ہے اسے جیسا کہ واجب ہے پورا کرنے کا بندوبست کرے[1]"

اس مختصر سے معاہدہ کے ذریعہ لارڈ کرزن نے صرف یہی فائدہ نہیں اٹھایا کہ برار کا دوامی پٹہ حاصل کر لیا جو پچاس سال پہلے باوجود "دھمکیوں اور بھبکیوں" (Oburgations & Threats) حاصل نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ برار کو ناگپور کی کمشنری سے ملحق کرکے ایک صوبہ متوسط بنانے کی تمنا بھی پوری کر لی جسے ۱۸۶۰ء میں نواب افضل الدولہ نے رد کر دیا تھا اور حیدرآباد کنٹیجنٹ کو توڑ دینے کا بھی اختیار حاصل کر لیا حالانکہ اسی فوج کی خاطر صوبہ برار سرکار نظام سے حاصل کیا گیا تھا اور اس فوج کو توڑ دینے کے بعد اس صوبہ پر انگریزی قبضہ رہنے کی کوئی معقول کیا معنی نامعقول وجہ بھی نہ تھی ایسے عظیم فوائد کے مقابلہ میں انگریزی حکومت نے صرف ۲۵ لاکھ سالانہ کی رقم پیش کی اور وہ بھی اس شرط کیساتھ کہ اسمیں سے بیس سال تک ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ برار کے قرضوں (Berar loan) میں اور ایک غیر متعین مدت تک ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ حیدرآباد کے قرضوں (Hyderabad loan) میں وضع کیا جاتا رہے گا اور سرکار نظام کو ان سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے صرف ساڑھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ ملے گا۔ بعد میں سرکار نظام کی درخواست پر اس شرط میں

---

[1] Aitchisons Treaties IX P. 175.

تھوڑی سی ترمیم ہوگئی جس کے مطابق ایسا انتظام ہوگیا کہ ۲۵ لاکھ کی پوری رقم تیس سال بعد سرکار نظام کو ملنی شروع ہوجائے گی۔ چنانچہ ابھی اس وقت کے آنے میں چند سال باقی ہیں۔

یہ معاہدہ تو بیشک ہوا اور سرکار نظام نے اسکی تصدیق بھی کی لیکن سوال یہ ہے کہ قانونی حیثیت سے یہ کہاں تک ایک جائز معاہدہ تھا؟ اس کیلئے حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم برار کا دوامی پٹہ لکھنے کیلئے ہرگز تیار نہ تھے جس وقت یہ تجویز ان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اور امراء و اعیان سلطنت کی کونسل نے بالاتفاق اس کی مخالفت کی اور ۳۰ مارچ ۱۹۰۲ء کو سب کے مشورہ سے اعلیٰ حضرت مرحوم کی جانب سے ایک خط لارڈ کرزن کے نام لکھا گیا جسے خود مرحوم اپنے ہاتھ سے پیش کرنیوالے تھے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ :-

"میں اس پرانے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ استرداد برار کے لئے میرے حقوق کیا ہیں یا اس کے متعلق معاہدات اور دوسرے سرکاری عہود و مواثیق کے معنی کیا ہیں میں پورے بھروسہ کے ساتھ ان معاہدات کو یور اکسلنسی کی توجہات کریمانہ و مشفقانہ پر چھوڑتا ہوں میں آپ کے توسط سے ہز مجسٹی شہنشاہ معظم کی خدمت میں صرف یہ گذارش کروں گا کہ وہ لطف و کرم کی ایک خاص علامت کے طور پر برار واپس کردیں اور میں یہ اجازت چاہونگا کہ یور لارڈ شپ کو اس معاملہ میں اپنا وکیل بناؤں میں پورا یقین رکھتا ہوں اور مجھے

کامل بھروسہ ہے کہ میری یہ گذارش ہز مجسٹی کی تاج پوشی کے مبارک موقع پر رائیگاں نہ جائے گی۔"

(۳) اعلیٰ حضرت مرحوم اپنے اس مطالبہ سے ہٹکر دوامی پٹہ کی تجویز کو قبول کرنے پر صرف اس وقت راضی ہوئے جب لارڈ کرزن نے انکو پورے زور کے ساتھ یہ یقین دلا دیا کہ پچھلے معاہدات کی رو سے انکو برار کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ ایسا کرینگے بھی تو اسے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا۔ معاہدہ گفت و شنید کے متعلق لارڈ کرزن نے جو نوٹ لکھا تھا اس میں وہ خود کہتا ہے کہ :-

"میں نے جب سنا کہ ایسی صریح فائدہ مند شرائط ہز ہائی نس کو پسند نہیں آئیں تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اگر ان شرائط کو رد کر دیا گیا تو حکومت ہند پھر موجودہ پوزیشن کی طرف رجوع کریگی جس کے لئے کوئی مدت متعین نہیں ہے اور جسمیں ہم پچاس سال سے نسبتہً بہت کم مالی معاوضہ دیکر اس شئے سے استفادہ کر رہے ہیں جو در اصل مقصود بالذات ہے اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی جسکی بناء پر مجھے موجودہ تجاویز کے ناکام ہونے پر افسوس کرنا چاہئیے اگر ان کو رد کر دیا گیا تو یہ حد درجہ غیر متوقع ہے کہ میرے بعد آنیوالا کوئی وائسرائے اس سوال کو دوبارہ چھیڑیگا یا برطانیہ کی کوئی حکومت اپنی بات کو دوبارہ رد کرانا پسند کریگی۔ اس لئے ہز ہائی نس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے کہ تصفیہ کا جو موقع اب ان کو دیا جا رہا ہے اس کے دوبارہ پیش کئے جانے کی توقع نہیں ہو سکتی اور یہ کہ ایسی صورت میں معاملات کی موجودہ ترتیب

ہی ایک دائمی صورت اختیار کر لیگی۔

"مگر انہوں نے (یعنی نظام نے) یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ آیا جدید تصفیہ میں انہیں آزادی باقی رہیگی کہ آئندہ کسی وقت وہ برار کی واپسی کا مطالبہ کریں؟ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ اگر برار دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کو دیدیا گیا تو ہز ہائی نس کے لئے ایسی کوئی درخواست کرنے کا موقع نہ رہیگا کیونکہ اسوقت صوبہ کی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی پٹہ کے ذریعہ ہو چکا ہوگا۔ پھر ہز ہائی نس نے پوچھا کہ آیا موجودہ حالات میں اس کا کوئی امکان ہے کہ برار ان کو واپس دیدیا جائے؟ میں نے جواب دیا کہ معاہدات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے استرداد برار کا تصور کیا جاسکے یا جس سے حیدرآباد کو استرداد کا کوئی حق پہنچتا ہو...... برٹش گورنمنٹ کیلئے مجوزہ شرائط کا بدل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اس دوامی تفویض پر قائم رہے جو پہلے ہی سے از روئے معاہدات اس کو حاصل ہے تب ہز ہائی نس نے کہا کہ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے برار واپس ملنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے لہذا مجھے مجوزہ دوامی پٹہ لکھ دینے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ریاست کے مفاد کے لئے زیادہ اچھا ہے اب تک میں اس کو صرف اس لئے نامنظور کر رہا تھا کہ میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ آئندہ مجھے برار واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

خود اعلیٰ حضرت مرحوم نے بھی اس ملاقات کی کیفیت لکھتے ہوئے اپنے نوٹ میں صاف لکھا ہے کہ:۔

وائسرائے نے مجھ سے دوبارہ سہ بارہ کہا کہ برار کبھی واپس نہیں دیا جاسکتا ہز ایکسلنسی نے کہا کہ میں یورہائی نس کو کسی غلط امید میں نہیں رکھنا چاہتا

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ محض میری ہی نہیں بلکہ تمام وائسرایوں
کی جو میرے بعد آئیں گے یہی پالیسی ہوگی، اور انگلستان میں بھی حکومت کی یہی پالیسی
ہوگی جو کہ برار کبھی کسی زمانہ میں واپس نہ کیا جائے۔" وائسرائے کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
چونکہ گذشتہ ۲۵ سال کے درمیان برار کی واپسی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں
کی گئی اس لئے اب یہ ہمارے لئے ناممکن ہے کہ اسے واپس حاصل کرسکیں اور
اب ہمیں اسکی واپسی کی کوئی امید نہ کرنی چاہئے۔ ہز اکسلنسی نے بیان کیا کہ
اگر موجودہ صورت حال برقرار رکھی گئی تو اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل
نہ ہوگا، جب برار کو واپس کرنا ناممکن ہے تو موجودہ حالت کو برقرار رکھنا
خلاف عقل ہے اس سے بہتر ہے کہ اس کو پٹہ پر دیدیا جائے اور اس کے
عوض سال بہ سال روپیہ لے لیا جائے۔" تاہم میں نے کوشش کی جہاں تک
میں کرسکتا تھا کہ واپسی پر اصرار کروں مگر وائسرائے کے جوابوں کا انداز
دیکھکر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ہمکو برار واپس نہیں دینگے۔ یہ پچھلی غلطیوں کا نتیجہ
ہے کہ آج ہم کو اس صوبہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس وقت میں یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ
اگر یہ صورت ہے تو اسے پٹہ پر لے لیجئے۔

فریقین کے ان بیانات کو پڑھ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے
نے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان سے برٹش گورنمنٹ کو
برار کی دوامی تفویض (Perpetual assignment) پہلے
سے حاصل ہے اور نظام کا حق استرداد ان معاہدات کی رو سے کلیتہً زائل ہوچکا
ہے۔ اگر وائسرائے سابقہ معاہدات کی یہ تعبیر کرکے اعلیحضرت مرحوم کو یہ قطعی یقین نہ

دلا دیتا کہ برار کے واپس دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق اعلیٰحضرت مرحوم دوامی پٹہ کو ہرگز قبول نہ کرتے۔

(۳) سابقہ معاہدات اور حکومت برطانیہ کی سرکاری تصریحات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ وائسرائے کی یہ تعبیر بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعہ تھی۔ تفویض برار کے پہلے معاہدہ کے وقت حکومت ہند کے وکیل مختار کرنل لو نے نواب ناصر الدولہ مرحوم کو یہ یقین دلایا تھا کہ :-

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹیجنٹ کی پرورش کی غرض سے محض اس وقت تک کے لئے تفویض کئے جا سکتے ہیں جب تک انہیں اس کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جب (ہز ہائی نس کے خواہش کرنے پر) یہ ساری فوج توڑ دی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں"[1]

اس کے بعد ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کی جانب سے یہ یقین دلایا گیا کہ :-

"مفوضہ اضلاع کے ایک حصہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے حکومت ہند کا مقصد صرف یہ ہے کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ششم کی شرائط کو پورا کرنے کیلئے وہ ایک مادی ضمانت اپنے پاس رکھے گورنمنٹ آف انڈیا نے جس طرح ابتک تمام اضلاع مفوضہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اسی طرح اب بھی وہ اس علاقہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ ہز ہائی نس کی طرف سے اپنی "امانت" میں (Interest) صرف اس وقت تک کیلئے رکھنا چاہتی ہے جب تک

---

[1] دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۴ مئی ۱۸۵۳ء نمبر ۱۷ صیغۂ خارجہ

کنٹیجنٹ رکھی جائے اس سے زیادہ عرصہ کے لئے وہ نہیں رکھنا چاہتی...

.... اور یہ واقعہ ہے کہ ہزہائی نس نے مقبوضات کے اس حصہ کا انتقال محض عارضی (Temporary only) ہے... جب کبھی اضلاع زیر بحث نظام کو واپس کئے جائیں گے تو ہز ہائی نس ان تمام فوائد سے متمتع ہوسکیں گے جو برطانی افسروں کے زیر انتظام رہنے کے زمانہ کی ترقیات سے ممکن ہے کہ آئندہ پیدا ہوں"[1]

اس کے بعد ۲۶ دسمبر ۱۸۶۰ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی دفعہ ۶ میں بصراحت یہ لکھا گیا تھا کہ

"اضلاع واقع برار جو پہلے ہی معاہدہ ۱۸۵۳ء کے ماتحت برٹش گورنمنٹ کو تفویض کئے جا چکے ہیں معہ ان تعلقات صرفخاص کے جو ان میں واقع ہیں اور معہ ان مزید اضلاع متصلہ کے جو بحالت موجودہ ۳۲ لاکھ روپیہ سکہ حکومت برطانیہ کی سالانہ آمدنی دینے کے لئے کافی ہوں۔ برٹش گورنمنٹ کے پاس امانت میں (Interest) رہیں گے تاکہ ان سے حیدرآباد کنٹیجنٹ کی تنخواہیں اور آپا دیسائی کی چوتھ، جھیپت رام کے خاندان کا سالیانہ اور چند دوسری پنشنیں جن کا ذکر عہدنامہ مذکور کی دفعہ ششم میں کیا گیا ہے ادا کی جائیں"[2]

اس کے بعد ۵ جنوری ۱۸۶۱ء کو لارڈ کیننگ (وائسرائے) نے سر چارلس ووڈ (وزیر ہند) کو جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں وہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے۔

---

[1] دیکھو مسٹر بنیک ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ نمبر ۳۸۸۹ صیغۂ خارجہ

[2] ایچی سن جلد ۹ صفحہ ۱۰۶

"نظام کو بتایا گیا کہ حکومت ہند اضلاع مفوضہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ اپنی "امانت" میں رکھنا چاہتی ہے اور صرف اس وقت تک رکھنا چاہتی ہے جب تک کہ کنٹینجنٹ رکھی جائے نہ کہ اس سے زیادہ ...... ان سے کہا گیا کہ اضلاع برار اب بھی ہز ہائی نس کے مقبوضات کا ایک غیر منفک جز ہیں۔ اور وہ ان کو اس وقت بہ تمامہا واپس کر دیئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہوگا کہ اس قرارداد کو بدل دیں جس کے تحت کنٹینجنٹ رکھی گئی ہے"[1]

اس کے بعد سر سالار جنگ کے پیہم مطالبات کے جواب میں ۲۸ مارچ ۱۸۶۷ء کو جو "آخری اور قطعی" فیصلہ لارڈ سالسبری نے وزیر ہند ہونے کی حیثیت سے صادر کیا تھا، اس میں بھی یہ تصریح موجود تھی کہ :۔

"یہ بالکل ظاہر ہے کہ معاہدہ میں برار کو قطعی طور پر حوالہ نہیں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی ایسا ہی انتظام چاہتے تھے مگر اس پر نظام کو ایسے اعتراضات تھے جن کو ان کے ذہن سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا اور انہیں قبول کرنے پر انہیں مجبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر تفویض قطعی ہوتی تو ملکیت بہ تمامہا تاج برطانیہ کی طرف منتقل ہو جاتی مگر کوئی انتقال ملکیت وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ یہ علاقہ نظام کے مقبوضات میں اسی طرح شامل رہا جس طرح معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے تھا...... اگر ہز ہائی نس (جو اس وقت تک سن بلوغ کو نہ پہونچے تھے) امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ یہ خواہش کرینگے کہ ان تمام معاملات پر جو دولتین کے درمیان از روئے معاہدہ

---

[1] دیکھو لارڈ کیننگ کا مراسلہ نمبر ۴ صیغہ خارجہ

طے ہوئے ہیں ایک عام نظر ثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس کی اس درخواست پر غور کرے گی۔"

یہ تمام سرکاری تحریرات اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ برار کی تفویض "دوامی" (Perpetual) نہیں تھی جیسا کہ لارڈ کرزن نے اسکو ۱۹۰۲ء میں ظاہر کیا بلکہ "عارضی" (Temporary) تھی جیسا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۷۵ء تک ریذیڈنٹ سے لیکر وزیر ہند تک تمام ذمہ دار افسران متعلق اظہار و اعلان کرتے رہے تھے، یہ دستاویزات لارڈ کرزن کی اس تعبیر کو بھی بالکل غلط ثابت کرتی ہیں کہ "معاہدات میں حضور نظام کے لئے استرداد برار کا کوئی حق محفوظ نہیں رکھا گیا ہے۔" برعکس اس کے خود وہ وائسرائے جس نے ۱۸۶۰ء کا معاہدہ طے کیا تھا اپنے معاہدہ کی یہ تعبیر کرتا ہے کہ برار کی تفویض ایک امانت (Trust) کے طور پر تھی اور کنٹنجنٹ کی برطرفی کے بعد اسکو ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہیں رہنا تھا۔ لارڈ کرزن نے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان کے ماتحت صرف دو ہی صورتوں پر عمل کیا جاسکتا تھا ایک یہ کہ برار کا دوامی پٹہ لکھدیا جاتا اور دوسرے یہ کہ تفویض کی موجودالوقت صورت کو دواماً جاری رکھا جاتا۔ اسکے سوا تیسری صورت کو اس نے ناممکن قرار دیا۔ حالانکہ کرنل لو اور لارڈ کیننگ جو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کے اصلی بانی تھے انہوں نے صراحت کیساتھ تیسری صورت یعنی برار کی واپسی کا نہ صرف امکان ظاہر کیا تھا بلکہ ان کے نزدیک عارضی تفویض کو برار کی واپسی ہی پر ختم ہونا چاہئے تھا اس معاملہ میں لارڈ کرزن نے ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی بھی کھلی ہوئی معنوی تحریف کی جس کے اندر بالفاظ صریح یہ لکھا تھا کہ

برار کی تفویض "امانت" (Trust) کے طور پر ہے اور لارڈ سالسبری کے صریح وعدہ کو بھی پس پشت ڈال دیا جس میں سرکار نظام کو یقین دلایا گیا تھا کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں جب سن بلوغ کو پہونچکر بذات خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو انہیں برار کی واپسی کے مسئلہ کو از سر نو چھیڑنے کا حق ہوگا۔ ان تمام سرکاری شہادتوں کے خلاف لارڈ کرزن نے معاہدات کی غلط تعبیر کرکے اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کو صریح دھوکا دیا اور ایک غلط اور ناجائز اثر ڈالکر انہیں دوامی پٹہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔

(۴) تفویض برار کی اصلی علت یہ تھی کہ کنٹیجنٹ کی پرورش کیلئے برٹش گورنمنٹ کو بقول لارڈ کیننگ کے ایک مادی ضمانت (Material Guarantee) اور بقول سالسبری کے ایک ارضی ضمانت (Territorial Guarantee) کی ضرورت تھی، اول اول جب اس کا مطالبہ کیا گیا تھا تو یہی کہا گیا تھا کہ چونکہ کنٹیجنٹ کی تنخواہیں ٹھیک وقت پر باقاعدگی کے ساتھ نہیں ملتیں اسلئے ہمارے ہاتھ میں ایک مستقل ذریعہ آمدنی (Permanent Source of Income) ایسا رہنا چاہئے جس سے ہم اس ذمہ داری کو ادا کرسکیں چنانچہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کی دفعات نمبر ۶ میں اس تفویض کی اصلی غرض اسی کو بیان کیا گیا تھا اور دونوں معاہدات کی ترتیب کے وقت یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جب کنٹیجنٹ کی ضرورت باقی نہ رہے گی تو تفویض منسوخ ہوکر ملک اس کے اصلی مالک کو واپس کردیا جائیگا۔ کرنل لو نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ "جب یہاری فوج توڑدی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی تو

نظام ان اضلاع کو لے سکتے ہیں۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ نے کہا تھا کہ:۔

"وہ (یعنی اضلاع برار) نظام کو اس وقت یہ تمام واپس کر دیئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہوگا کہ ان قراردادوں کو بدل دیں جن کے ماتحت کنٹیجنٹ رکھی گئی ہے۔"

ان سرکاری اتصریحات کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جب کنٹیجنٹ کے برطرف کر دینے پر دونوں حکومتوں کے درمیان اتفاق ہوجاتا تو وہ ملک جو کنٹیجنٹ کی تنخواہوں کے لئے لیا گیا تھا واپس کر دیا جاتا۔ لیکن لارڈ کرزن نے معاہدات کے اسپرٹ اور الفاظ دونوں کے خلاف یہ کیا کہ جب دونوں سلطنتوں کے درمیان کنٹیجنٹ کے برطرف کرنے پر اتفاق ہوگیا تو کنٹیجنٹ کو تو توڑ دیا مگر ملک کو جو کنٹیجنٹ کی خاطر "ضمانت" میں لیا گیا تھا واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لارڈ کرزن خود اپنے نوٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

"حیدرآباد کنٹیجنٹ جیسی کہ وہ اس وقت معاہدات کے ماتحت قائم ہے ایک فضول خرچ اور ناقابل اطمینان شئے ہے حیدرآباد کے علاقہ میں جو فوجیں مقیم ہیں وہ جدید ضروریات سے بالکل زائد ہیں اور ان کا اس نام سے باقی رہنا ہز ہائی نس کیلئے نفرت انگیز بھی ہے اور بے موقع بھی۔"

۹۰ برس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کنٹیجنٹ کو "فضول خرچ" "ناقابل اطمینان" "زائد از ضرورت" "نفرت انگیز" اور "بے موقع" تسلیم کیا گیا اور اسکے توڑ دینے پر سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان اتفاق رائے ہوگیا۔ اس اتفاق رائے

سے اضلاع برار کو بہ تمامہا واپس کر دینے کے لئے وہ شرط پوری ہو چکی تھی جو ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ نے مقرر کی تھی۔ مگر لارڈ کرزن نے عقل، منطق، معاہدات اور مواعید سب کے خلاف علت کو فوت کرنے کے بعد بھی معلول کو برقرار رکھا اور کنٹنجنٹ کو توڑ دینے کے باوجود ملک کو اپنے قبضہ میں رکھنے پر اصرار کیا حالانکہ اب سرکار نظام کی طرف سے انگریزی حکومت پر کوئی ایسی ذمہ داری باقی نہ تھی جس کو ادا کرنے کے لئے کل ممالک محروسہ کا تیسرا حصہ اس کو دینے کی ضرورت باقی رہتی۔

یہ امور ایسے ہیں کہ جن کی بنا پر ۱۹۰۲ء کا یہ معاہدہ قطعاً ناجائز قرار پاتا ہے اور اسکی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں رہتی کہ سلطنت برطانیہ کے وائسرائے نے اپنے وفادار دوست کو دھوکہ دیکر اور غلط باتیں باور کرا کے لاعلمی کی حالت میں ایسی دستاویز پر دستخط حاصل کر لئے جس پر خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ ہرگز دستخط نہ کرتا اگر ان معاہدات کے اصلی معانی سے باخبر ہونے دیا جاتا، لارڈ کرزن نے قصداً اعلیٰحضرت مرحوم سے تنہائی میں یہ معاملہ طے کیا مدارالمہام یا کسی اور واقف کار و معاملہ فہم مشیر تک کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہ دی اور ان کو ناواقفیت میں بزور و بہ اصرار غلط باتوں کا یقین دلا کر انکے آبائی ملک کا سب سے زیادہ زرخیز حصہ ہمیشہ کے لئے ان سے حاصل کر لیا۔

یہ سلوک تھا سلطنت برطانیہ کا اپنے دوست کے ساتھ جس نے چند سال پہلے جوش وفاداری میں ۶۰ لاکھ روپیہ اسکی اعانت کیلئے پیش کیا تھا ممکن ہے کہ وفاداری کی قدر شناسی کا یہی وہ طریقہ ہو جس پر برطانی قوم فخر کرتی ہے۔

اعلیٰحضرت میر عثمان علیخان بہادر کا دور

۱۹۱۱ء میں اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ فرمانروائے حال اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر مسند آرائے سلطنت ہوئے آپکے زمام امور ہاتھ میں لینے کے تین ہی سال بعد وہ جنگ عظیم برپا ہوئی کہ جسمیں انگریزی حکومت کیلئے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہوگیا۔ اس نازک وقت میں مسلمانوں کیلئے سلطنت برطانیہ کا وفادار رہنا سب سے زیادہ مشکل تھا، کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت جس کے بادشاہ کو تمام مسلمان اپنا امام سمجھتے تھے برطانیہ کے خلاف برسرپیکار تھی اور وہ ممالک اعمال جنگ کی زد میں تھے جن کی تنظیم و تکریم ہر مسلمان کا جزو ایمان تھی لیکن اس موقع پر اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر نے سلطنت برطانیہ کے ساتھ وہ وفاداری برتی جو اس سلطنت کے تمام دوستوں کی وفاداری سے زیادہ قیمتی اور خود اعلیٰحضرت کے پیشروؤں کی وفاداریوں پر بھی فائق تھی۔

ایک طرف حضور ممدوح نے اپنے اس اخلاقی و روحانی اثر کو استعمال کیا جو انہیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر حاصل تھا، اور مسلمانوں کو پورے زور کے ساتھ تلقین کی کہ وہ سلطنت برطانیہ کے مواعید پر بھروسہ کرکے اسکی وفاداری پر ثابت قدم رہیں یہ اخلاقی امداد اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ خود انگریزی سلطنت کے ارباب حل وعقد کو اعتراف ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جن اثرات کے ماتحت جنگ میں سلطنت کی امداد کی ان میں سب سے زیادہ

حصہ اعلیحضرت نظام دکن کا تھا۔

دوسری طرف اعلیحضرت نے اپنی سلطنت کے تمام ذرائع دولت برطانیہ کیلئے وقف کر دیئے اس سلسلہ میں انہوں نے جو خالص مالی امداد دی اس کی کیفیت ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔

قرضہ جنگ میں	۱۴۶۰۰۰۰۰
تکمیل جنگ کے لئے بطور امداد	۱۸۲۰۹۶۰۰
بیسویں دکن ہارس اور امپیریل سروس ٹروپس کے مصارف بحساب ۳ لاکھ روپیہ ماہانہ	۱۳۴۰۰۰۰۰
جنگ کو اختتام تک پہنچانے کے لئے خاص عطیہ	۱۵۰۰۰۰۰
تحت البحر کشتیوں کی مدافعت کے لئے	۱۵۰۰۰۰۰
شاہ و ملکہ کے ازدواج کی ۲۵ سالہ یادگار کے موقع پر	۳۷۵۰۰۰
پرنس آف ویلز رلیف فنڈ	۱۰۰۰۰۰۰
امپیریل رلیف فنڈ	۱۰۰۰۰۰
متفرق اعانتیں	۱۳۴۶۰۰

اس کے علاوہ دوران جنگ میں سرکار عالی کے تمام کارخانے سامان حرب کی طیاری کے لئے وقف رہے اور چار سال کی مدت میں انہوں نے ۹ لاکھ روپیہ کا سامان سلطنت برطانیہ کیلئے مہیا کیا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی عزیز رعایا کو ہزاروں کی تعداد میں بھرتی کر کے میدان جنگ میں جانیں قربان کرنے کے لئے بھیجا آغاز جنگ سے اختتام تک دولت آصفیہ کی باضابطہ فوج جنگ کی اعلیٰ خدمات انجام

دیتی رہی اور اس کا خرچ سرکار نظام نے اپنے خزانہ سے دیا۔ حکومت ہند کی شدید مالی مشکلات کے زمانہ میں ۔ ۵ لاکھ روپے کی چاندی کی اینٹیں مستعار دیکر اس کی مالی ساکھ کو سنبھال لیا اور اسی طرح کی بیش قیمت اور مخلصانہ اعانتوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ زمانہ آ گیا جب ایسی ہی دوستانہ اعانتوں کی بدولت یہ سخت وقت سلطنت برطانیہ سے ٹل گیا جس میں اس کا برباد ہو جانا کچھ مستبعد نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اعلیٰحضرت کو ان کے ان گراں قدر احسانات کا بدلہ کیا ملا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک زبانی جمع خرچ کا تعلق ہے بہت دل کھول کر احسان شناسی و اعتراف جمیل کا ثبوت دیا گیا۔ اعلیٰحضرت کو "ہز اگزالٹیڈ ہائی نس" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ انہیں "یار وفادار سلطنت برطانیہ" (Faithfull ally of the British Govt.) کا لقب عطا کیا گیا۔ شہنشاہ معظم سے لیکر ولی عہد و السرائے اور رزیڈنٹ تک سب نے متعدد مرتبہ ان کو بیش بہا خدمات پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے لیکن جب عملی احسان شناسی کا وقت آیا تو سلطنت برطانیہ کا رویہ یک سر مو بھی اسکی روایات قدیمہ کے خلاف نہ نکلا۔

اعلیٰحضرت کا مطالبہ استرداد برار

جنگ عظیم کے کامیاب اختتام کے بعد ہی ہندوستان میں ستیا گرہ، خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہو گئیں، جنہوں نے کچھ عرصہ کیلئے عظیم الشان

برٹش انڈین امپائر کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا، ان نازک و پیچیدہ سیاسی حالات میں اعلیحضرت نے اپنے حقوق طلب کر کے سلطنت برطانیہ کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا اپنی خاندانی شرافت کے خلاف سمجھا اور صرف یہی نہیں کہ حق طلبی سے محترز رہے بلکہ ان وطنی اور اسلامی تحریکات میں بھی سلطنت برطانیہ کو اخلاقی امداد دیتے رہے اور اپنی ریاست میں تحریک خلافت تک کو بند کرا دیا جس کی بدولت اعلیحضرت کے متعلق ان کی ملت میں شدید بدگمانیاں پھیل گئیں۔

آخر جب یہ ہنگامہ و اضطراب کا دور ختم ہوا اور برٹش گورنمنٹ تمام اندرونی و بیرونی مشکلات سے نجات پاکر نسبتاً پرسکون حالت میں ہوگئی تو اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں بہادر نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے کھوئے ہوئے صوبہ کی واپسی کا مطالبہ کریں اس غرض کے لئے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حضور ممدوح نے لارڈ ریڈنگ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے برار کے متعلق اپنے دعاوی وضاحت کے ساتھ پیش فرمائے اور اس کے ساتھ ایک میمورنڈم بھی منسلک کیا جو اعلیٰ حضرت کے دعاوی کے متعلق تمام دستاویزی شہادتوں پر مشتمل تھا۔ یہ خط جنوری ۱۹۲۴ء کے اواخر میں عام طور پر شائع ہو چکا ہے، اس لئے اسکو نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے، البتہ اختصار کے ساتھ اسکے اصولی نکات ذیل میں درج کر دیئے جاتے ہیں۔

(۱) ۱۷۶۶ء میں پہلی مرتبہ برٹش گورنمنٹ نے دولت آصفیہ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ بوقت ضرورت اس کی فوجی امداد کرے گی اور دولت آصفیہ نے اس امداد کے معاوضہ میں شمالی سرکار کا علاقہ برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا تھا۔

(۲) ۱۷۹۸ء میں اسی فوجی امداد کے لئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھی

گئی اور اس کے لئے ۲۴۱۷۱۰۰ روپیہ کا خرچ دولت آصفیہ کے ذمہ عائد کیا گیا۔

(۳) ۱۸۰۰ء میں اس امدادی فوج کی مصارف کے لئے دولت آصفیہ سے ایک دوسرا علاقہ لیا گیا جس کی آمدنی ۶۳ لاکھ روپیہ سالانہ تھی، اسوقت یہ عہد کیا گیا تھا کہ یہ امدادی فوج ان تمام قوتوں کے خلاف ہر وقت استعمال کیجا سکے گی جو دولت آصفیہ کے امن و سکون میں اندر سے یا باہر سے خلل انداز ہونگی۔ نیز اس کو ایسی حالت میں بھی استعمال کیا جاسکے گا۔ جبکہ سرکار نظام کی رعایا میں سے کوئی اس کی اطاعت سے انحراف کریگا یا خراج ادا کرنے میں پہلو تہی کرے گا۔

(۴) اس معاہدہ کے بعد جب سرکار نظام کو اپنی باغی رعایا کی سرکوبی کیلئے فوجی امداد کی ضرورت ہوئی تو اس فوج کی خدمات دینے سے انکار کیا گیا جو ۶۳ لاکھ کا ملک لیکر اسی غرض کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اور ایک دوسری فوج انہی خدمات کو انجام دینے کے لئے قائم کی گئی جس کے لئے مزید ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا خرچ نظام کے ذمہ عائد کیا گیا۔

(۵) اس جدید فوج کا قیام نہ کسی معاہدہ پر مبنی تھا نہ اس کیلئے سرکار نظام سے اجازت لیگئی، اور نہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ جائز تھا کہ ان خدمات کا معاوضہ دوبارہ وصول کرتی جن کا معاوضہ وہ پہلے وصول کرچکی تھی مگر صرف یہی نہیں کہ یہ معاوضہ وصول کیا گیا بلکہ سرکار نظام سے فوج کا خرچ وصول کرنیکے باوجود اس کے تمام انتظامات کلیتہً انگریزی رزیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھے گئے۔

(۶) ۱۸۵۳ء میں اس فوج کے بقایا ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) سرکار نظام کے ذمہ قرض کے طور پر نکالا گیا، حالانکہ ۴۱ سال تک برٹش گورنمنٹ سکندرآباد اور

جالنہ کی آبکاری کا محصول بلا کسی حق کے وصول کرتی رہی تھی اور ۳۰ سال تک اس نے امدادی فوج کو جس کا خرچ وہ پہلے وصول کر چکی تھی۔ مقررہ تعداد سے زائد از ۲۵ فیصدی کم تعداد میں رکھا تھا اگر دونوں سلطنتوں کے مطالبات کا باضابطہ محاسبہ کیا جاتا تو برٹش گورنمنٹ کے ذمہ خود سرکار نظام کا الٹا قرض نکل آتا۔ لیکن برٹش گورنمنٹ نے باوجود پیہم مطالبہ کے حساب فہمی کرنے سے اعتراض کیا اور اپنے ۴۳ لاکھ روپے کی کفالت اور آئندہ کے لئے اس ناجائز فوج کے مصارف کی کفالت میں سرکار نظام سے اس کے ملک کا ایک اور حصہ طلب کیا۔

(۷) نظام اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے راضی نہ تھے مگر کمپنی نے فوجی حملہ کی دھمکی دیکر اور یہ خوف دلا کر کہ ان کی جان اور انکی سلطنت کی بھی خیر نہیں ہے۔ انہیں اس پر راضی کیا اور اس طرح اضلاع برار، دوآبہ رائچور اور دھاراسیو کی تفویض عمل میں آئی۔

(۸) ۱۸۵۳ء کا معاہدہ اس صریح مفاہمت کے ساتھ ہوا تھا کہ اضلاع مفوضہ صرف اس وقت تک برٹش گورنمنٹ کے تصرف میں رہیں گے جب تک سرکار نظام کو کنٹیجنٹ کی ضرورت رہے گی اور یہ کہ جب سرکار نظام اس فوج کو توڑنے کی خواہش کریگی تو اسے توڑ دیا جائے گا اور ملک اس کے اصلی مالک کو واپس دیدیا جائیگا۔ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں اسکی دوبارہ توثیق کی گئی۔

(۹) ۱۸۶۷ء میں جب سرکار نظام کی جانب سے کنٹیجنٹ کو توڑنے کی خواہش ظاہر کی گئی تو اور اضلاع مفوضہ واپس مانگے گئے تو انکا جواب یہ دیا گیا کہ فرمانروائے وقت کی نابالغی کے زمانہ میں ایسے مسائل پر بحث کرنا خالی از وقت نہیں ہے

(۱۰) جب فرمانروائے وقت نے خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو وائسرائے کی زبان سے ان کو پورے زور کے ساتھ یہ یقین دلایا گیا کہ برار کی تفویض عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اسکی واپسی کا مطالبہ کرنیکا اب سرکار نظام کو کوئی حق باقی نہیں رہا اور اس امر کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ برار کبھی واپس نہ دیا جائے گا یہ غلط امور تمام پچھلے عہود و مواثیق کے بالکل خلاف باور کرا کے ۱۹۰۲ء میں فرمانروائے وقت سے دوامی پٹہ حاصل کر لیا گیا، اگر ان کو یہ غلط باور نہ کرایا جاتا تو خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ کبھی اس پٹہ کو منظور نہ کرتے

(۱۱) اگر بالفرض فرمانروائے وقت نے ۱۹۰۲ء کے تصفیہ کو برضا و رغبت قبول کیا تھا۔ تب بھی اس کا جواز مشتبہ ہے کیونکہ ایسا تصفیہ کرنا ان کے آئینی اختیارات سے باہر تھا اور ان حالات میں وہ اپنے ممالک کے کسی حصہ کو جو انکے پاس انکی رعیت اور ان کے جانشینوں کے لئے امانت کے طور پر تھا منتقل کر دینے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے۔

(۱۲) جبکہ برٹش گورنمنٹ نے معاہدات کرتے وقت سرکار نظام کے لئے برار کے استرداد کا حق صاف طور پر تسلیم کر لیا تھا اور برار کی تفویض کنٹیجنٹ کے بقا پر موقوف رکھی گئی تھی تو استحقاق پر بربنائے تصرف قدیم (Perscrition) کا قانوناً کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں جس معاملہ میں برطانیہ کی نیک نیتی کا سوال درپیش ہو اس میں تصرف قدیم کے استحقاق کو پیش کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے جب ۱۸۸۱ء میں میسور کی ریاست بحال کی گئی تھی تب بھی نیک نیتی اور انصاف کے مقابلہ میں تصرف قدیم کے استحقاق کو چھوڑ دیا گیا تھا۔

(۱۳) پٹہ پر کسی ملک کے دیئے جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ پٹہ دار کے املاک میں جذب ہو گیا۔ علیٰ ہذا القیاس ملک برار کے پٹہ پر دیئے جانے سے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی و دیوانی نظام میں جذب ہو جائے وہ اب بھی ریاست حیدرآباد کا ایک غیر منفک جزو ہے، مگر ۱۹۰۲ء سے اب تک جو سیاسی تغیرات ہوئے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مالی حیثیت سے اہل برار کی دولت غیر براریوں کے تصرف میں آ رہی ہے بلکہ جدید اصلاحات نے سیاسی حیثیت سے بھی ان کو باہر والوں کے تابع کر دیا ہے مثال کے طور پر صوبہ متوسط کی قانون ساز کونسل میں اپنی وہ کمی تعداد کی بناء پر ماتحت پوزیشن میں ہیں

ان وجوہ و دلائل کو پیش کر کے اعلیٰحضرت نے اپنے صوبہ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اس خیال سے کہ کہیں برطانی راج کی برکات سے اہل برار کے محروم ہو جانے کا پرانا عذر پھر نہ پیش کیا جائے، حضور ممدوح نے یہ بھی تصریح کر دی کہ وہ اہل برار کو حکومت میں اس سے زیادہ اشتراک عمل کا موقع دینگے جو اب تک برطانی راج میں ان کو حاصل رہا ہے اور ایک گورنر کے تحت ان کو ذمہ دار حکومت خود اختیاری دیگر داخلی نظم و نسق کے اعتبار سے بالکل آزاد کر دینگے۔

اعلیٰحضرت کے اس مدلل اور مدبرانہ خط پر دہلی اور لندن میں ڈیڑھ سال تک غور و خوض ہوتا رہا اور ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء کو لارڈ ریڈنگ کی طرف سے اس کا جواب ایک طویل خط میں دیا گیا۔ اس خط کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بنیادی مسائل سے اعراض کرنے کی وہی پرانی پالیسی اختیار کی گئی تھی

جیسے لارڈ سالسبری نے سر سالار جنگ کے جواب میں اختیار کیا تھا مسئلہ برار میں سب سے پہلا اور اصولی سوال یہ ہے کہ آیا کنٹنجنٹ قائم کرنا اور اس کے مصارف کا بار سرکار نظام پر ڈالنا جائز تھا یا نہیں؟ اگر جائز نہ تھا تو وہ قرض جسکی بناء پر برار کی تفویض عمل میں لائی گئی سرے سے بے بنیاد ہی ٹھہرتا ہے اور ساری عمارت پیوند خاک ہو جاتی ہے جس پہ برٹش گورنمنٹ کا قبضہ برار قائم ہے اس اہم ترین بنیادی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کے معنی اور حدود پر بحث کرنا ناگزیر ہے لیکن سالسبری کی طرح لارڈ ریڈنگ نے بھی اس نکتہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور اسے چھوڑ کر اس طرح گذر گئے کہ گویا یہ کوئی قابل اعتنا شے ہی نہیں ہے اسی طرح دوسرا اہم بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے برار کی تفویض قطعی تھی یا عارضی؟ مطلق تھی یا مقید تھی؟ اگر عارضی اور مقید تھی تو یقیناً لارڈ کرزن نے اسکو قطعی اور مطلق قرار دیکر ان معاہدات کی غلط تعبیر کی اور اعلیحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کو دھوکا دیا لارڈ ریڈنگ کے جواب میں پہلے نکتہ کی طرح یہ نکتہ بھی چھوڑ تا رہا اور ان دونوں ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر انھوں نے دفعۃً تیسرے اور آخری مرحلہ پر اپنا سارا وزن رکھدیا کیونکہ وہاں ان کو ذراسی پاؤں رکھنے کی جگہ ملتی تھی۔ ان کے سارے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ لارڈ کرزن اور فرمانروائے حیدرآباد کے درمیان ۱۹۰۲ء میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ برار کی قسمت کا آخری فیصلہ تھا اس کے بعد اب اس صوبہ کی قسمت کا سوال دوبارہ نہیں چھیڑا جاسکتا اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ لکھتے ہیں کہ :-

"نظام اچھی طرح اس مباحثہ کے لئے تیار تھے جو ان کے اور لارڈ کرزن کے
درمیان ہوا تھا۔ وہ خود اپنی مرضی سے تنہا ملاقات کیلئے آئے تھے۔ ان پر
وقت کے وقت جواب دینے کے لئے کوئی زور ڈالا نہیں گیا تھا بلکہ انہوں نے خود
ایسا کرنا پسند کیا حالانکہ لارڈ کرزن برابر یہ مشورہ دیتے رہے کہ وہ پورے غور و خوض
کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اس ملاقات کے بعد بھی ان کو ساڑھے تین مہینہ کا وقفہ
مل گیا جو انکی بے ضابطہ منظوری کی باضابطہ تصدیق سے پہلے گذرا تھا۔
انہوں نے یہ باضابطہ تصدیق ایسے الفاظ میں کی جو مجبوری کے خیال کو
تقویت دینے کے بجائے اعلیٰ درجہ کی طمانیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے
بعد ان کو پھر تین مہینے سے زیادہ کی مہلت عہدنامہ پر دستخط ہونے سے
پہلے مزید غور کے لئے مل گئی اور آخر میں خود انکی اپنی یادداشت سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاملہ کی اصلی صورت کے متعلق کبھی غلط فہمی میں نہ تھے۔"
اس سے لارڈ ریڈنگ نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ۱۹۰۲ء کا عہدنامہ کسی
دھوکا اور فریب سے یا کسی اثر سے نہیں کرایا گیا تھا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر فرمانروائے وقت
نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔ لیکن اگر اسے مان بھی لیا جائے کہ اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں
مرحوم کو سوچنے سمجھنے کا خوب موقع دیا گیا تھا اور وہ بحث کے لئے خوب تیار ہو کر آئے
اور انہوں نے آخری جواب دینے میں خود ہی جلدی بھی کی تھی۔ تب بھی اصل مسئلہ
پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اصلی سوال یہ ہے کہ جب وائسرائے نے ان سے
صاف طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ سابق معاہدات کی رو سے انکو استرداد برار کا کوئی
حق نہیں ہے۔ برار کی تفویض عارضی نہیں بلکہ دوامی ہے اور یہ لیز گورنمنٹ

یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ برار کو نہ اسوقت اور نہ آئندہ کبھی واپس دیگی تو ایسی حالت میں اعلیحضرت کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی گنجائش ہی کونسی باقی رہ گئی تھی لارڈ کرزن نے تو وائسرایانہ تحکم کے ساتھ استرداد کا دروازہ بند کرنیکے بعد ان کیلئے صرف دو راستے باقی چھوڑے تھے ایک یہ کہ ۲۵ لاکھ سالانہ کے عوض دوامی پٹہ لکھ دیں۔ دوسرے یہ کہ موجودالوقت صورت برقرار رکھیں جس میں ان کو برار کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی ملنے کی توقع نہ تھی۔ وائسرائے نے کہا تھا کہ وہ ابھی دونوں صورتوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتے ہیں اور تیسری صورت یعنی استرداد برار کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں اگر ان کو سوچنے اور سمجھنے کی مہلت بھی دی گئی تو وہ بے معنی تھی۔ لارڈ کرزن پر ہمارا اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اعلیحضرت کو سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی بلکہ اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے عارضی اور مقید تفویض کو دوامی اور مطلق قرار دیا۔ اگر ہمارا یہ اعتراض صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ ۱۹۰۲ء کا معاہدہ غلط اثر کے ماتحت ہوا اور اگر یہ اعتراض مسلم نہیں ہے تو بتایا جائے کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے عہد ناموں اور ان کے متعلق سرکاری اعلانات کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس معاملہ میں یہی ایک بنیادی سوال ہے اور اسی سے لارڈ ریڈنگ نے گریز کیا ہے۔

اس طرح لارڈ ریڈنگ نے اصول کو چھوڑ کر تمام تر غیر متعلق اور فروعی باتوں تک اپنے جواب کو محدود رکھا اور آخر میں لکھا کہ

"یور اگزالٹڈ ہز ہائی نس کا خط اس کے لواحق سمیت میں نے یہ سمجھ کر کہ یہی آپ کی خواہش تھی ہز میجسٹی کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجدیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان تمام نتائج سے متفق ہیں جن تک حکومت ہند پہنچی ہے، لہذا یہ فیصلہ

جسے میں آپ تک پہنچانے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ ہز میجسٹی کی حکومت کا فیصلہ ہے۔"

اگر لارڈ ریڈنگ کا جواب صرف بحث کی حیثیت رکھتا تو چنداں قباحت نہ تھی مگر بدقسمتی سے انہوں نے ایک طرف دعاوی کی تردید میں ناکافی اور بودے دلائل پیش کئے اور بنیادی مسائل پر بحث کرنے سے انکار کیا۔ اور دوسری طرف اپنے اس جواب کو "فیصلہ" کے رنگ میں لکھا اور نہ صرف اسپرٹ سے بلکہ الفاظ سے بھی یہ ظاہر کیا کہ "یہ فیصلہ" قطعی ہے یہ غیر معقول پوزیشن کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں بہادر نے ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ایک اور خط لکھا جس میں ان کے تمام دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس مسئلہ پر خصوصیت کیساتھ بحث کی کہ ایسے مسائل میں جو دو حلیف طاقتوں کے درمیان متنازع فیہ ہوں کسی فریق کو آخری فیصلہ کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟ اس کے متعلق حضور ممدوح نے لکھا۔

"حکومت برطانیہ کے ساتھ میرے تعلقات، نظام اور اپنی مملکت کا فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس مجموعی دو نامی اتحاد کے تابع ہیں جو میرے اسلاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان باہمی احترام دوستی اور اشتراک مصالح کی بنیاد پر ہوا تھا . . . . . باستثناء ان مسائل کے جو خارجی طاقتوں اور خارجی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیدر آباد کے نظام اپنی ریاست کے داخلی امور میں ویسے ہی خود مختار رہے ہیں جیسی برٹش گورنمنٹ برٹش انڈیا میں ہے

اس استثناء کے ساتھ جس کا ذکر میں نے کیا ہے فریقین نے ہمیشہ بین الحکومتی

مسائل میں جو قدرتی طور پر وقتاً فوقتاً ہمسایوں کے درمیان اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔ کامل آزادی اور خود مختاری کے ساتھ عمل کیا ہے۔ اب مسئلہ برار اس استثناء میں نہیں آتا اور نہیں آسکتا کوئی خارجی طاقت یا پالیسی اس تفحص میں متعلق یا مخل نہیں ہے پس یہ قضیہ دو ایسی حکومتوں کے درمیان متنازع فیہ رہجاتا ہے جو ایک ہی درجہ کی ہیں اور جنہیں سے کوئی کسی کی تابع نہیں ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس درجہ کے دو فریق ایک دوسرے کے دعاوی اور تجاویز کو رد کر دینے کی آزادی ضرور رکھتے ہیں مگر برٹش گورنمنٹ کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ پوچھنے سے احتراز نہیں کر سکتا کہ مسئلہ برار میں لفظ "فیصلہ" کا استعمال کہاں تک صحیح ہے۔ خارجی امور کو الگ کر کے میں برٹش گورنمنٹ کے ایک حلیف کی حیثیت سے اپنے لئے یہ حق محفوظ رکھنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ ہز میجسٹی کی حکومت کے اس انکار کو محض ایک "انکار" سمجھوں نہ کہ "فیصلہ"۔۔۔۔۔۔ میرے مطالبہ استرداد برار کے جواب میں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کا انکار محض آپکی رائے کا اظہار ہو تو سکتا ہے مگر وہ مجھ پر اور میرے خاندان پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ اب اس قضیہ کو ختم شدہ اور اپنے دعوے کو ہمیشہ کے لئے خارج شدہ سمجھ لیا جائے اس قسم کی پابندیاں ایسے حلفا پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتیں جو اپنے عہدناموں کی شرائط کے ماتحت آپکی پوری آزادی رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی تجاویز سے اتفاق کریں یا نہ کریں"

آگے چلکر اعلیحضرت نے لارڈ ریڈنگ کے ایک اور غلط طرز تعبیر پر اعتراض

فرمایا ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے قضیہ برار کو ایک ایسا قضیہ قرار دیا تھا جس کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق اعلیحضرت فرماتے ہیں۔

"اس لفظ (یعنی فیصلہ) کا استعمال ایک دوسری قانونی اصطلاح "امر فیصل شدہ" (Regudicate) کے ساتھ، مجھے پھر مجبور کرتا ہے کہ مسئلہ برار میں فریقین کی اعتباری حیثیت کے متعلق اپنے تصور پر مزید زور دوں .....

..... یور ایکسلنسی یقیناً جانتے ہونگے کہ میرے اسلاف یکے بعد دیگرے (برار کی دوامی تفویض کی) تجاویز کو رد کرتے رہے ہیں۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد ہز مجسٹی کی گورنمنٹ "امر فیصل شدہ" کا تصور کئے بغیر اپنی تجاویز کو پیش کرتی اور ان پر اصرار کرتی رہی ہے جس طرح اس وقت اس اصطلاح کا اطلاق درست نہیں تھا۔ اسی طرح اب بھی جبکہ میں اس مسئلہ کے از سر نو افتتاح اور اس کے واجبی اور مناسب تفحص کی درخواست کر رہا ہوں۔ اس کا اطلاق درست نہیں ہے، حلیفوں اور دوستوں کے درمیان اس قسم کے معاملات میں "امر فیصل شدہ" کا عذر کر کے تفتیش اور تجدید تجاویز کا سد باب نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کیا جانا چاہئیے۔ یہ قاعدہ تو مقننوں نے بالکل دوسرے ہی ظروف و احوال کے لئے وضع کیا تھا، جو ایسے فریقین اور ایسے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں جو نہ تو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور نظام سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں اور نہ زیر بحث مسئلہ سے کوئی مجانست"۔

اس کے بعد اعلیحضرت نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کا جج بنجانا، اور محض انکار کی صورت میں بلا دلیل آخری و قطعی فیصلہ

صادر کر دینا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ:-

"قطع نظر اس کے جو میں اوپر لفظ "فیصلہ" کے استعمال اور قضیہ برار پر قاعدہ "امر فیصل شدہ" کے متعلق کہہ آیا ہوں، ایک بے ضابطگی بھی جس کو نوٹس میں لائے بغیر چھوڑ دینا ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کوئی نزاع دو ایسے حلیفوں کے درمیان پیدا ہو، جو ایک خاص امر تصفیہ طلب میں ایک دوسرے کی نسبت تابعیت کی پوزیشن نہ رکھتے ہوں تو کیا آخری فیصلہ محض رد و انکار کی صورت میں صادر کرنے کا حق کسی ایک کے لئے محفوظ رہنا چاہئے؟ اس قسم کا ضابطۂ عمل تو یہ معنی رکھتا ہے کہ فریقین میں سے ایک جج بھی بن جائے۔ کسی امر متنازع فیہ میں اس طریقہ سے اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ جج اور فریق مقدمہ کا ذات واحد میں اجتماع ایک ایسا انتظام ہے جو بہت کچھ قابل طلب چھوڑ دیتا ہے۔[1] ایک نامور قانون داں اور انگلستان کے سابق چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے یور اکسلنسی مجھ سے زیادہ اسکی اہلیت رکھتے ہیں کہ ایسے اجتماع سے بتری کریں۔"

اس کے بعد اعلیحضرت نے لارڈ ریڈنگ کے تمام دلائل کا لفظ بلفظ جواب دیا تھا۔ آخر میں اپنی طرف سے تصفیہ کی یہ صورت پیش کی تھی کہ:-

---

[1] میں نے اس فقرہ کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اصل انگریزی میں جو لطف ہے اسے اردو میں منتقل کرنا مشکل ہے۔ دیکھئے کس قدر خوب لکھا ہے۔

Judge and Party in one is an arrangement that leaves much to be Desired

قضیہ برار کے متعلق امور متنازع فیہ کو ایک کمیشن کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اسکی تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے اور اس کا صدر ایک بلند پایہ اور اعلیٰ قانونی تجربہ رکھنے والا برطانی جنٹلمین ہو جسے وزیر ہند نامزد کریں اور صدر کے علاوہ اس کے چھ ارکان ہوں ان چھ میں سے دو حکومت ہند کے نامزد کئے ہوئے ہوں، دو میرے منتخب کئے ہوئے ہوں، اور دو خود اہل برار کے نمائندے ہوں جنہیں صوبہ متوسط کی کونسل، لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے غیر سرکاری براری ارکان منتخب کریں۔ اس طرح منتخب کئے ہوئے کمیشن کے لئے متعین مگر وسیع حدود بحث و تفتیش مقرر کئے جائیں تاکہ وہ ان تمام مسائل کی مکمل تحقیقات کرے جنمیں بدقسمتی سے ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے ان حدود کی تعین اس طرح ہوسکتی ہے کہ حکومت ہند کے شعبۂ سیاسیات کا ایک افسر اور میرا ایک آدمی یہ دونوں ملکر بحث کرلیں اور اس کے بعد میں اور یور اکسلنسی امور تنقیح طلب کو باتفاق رائے طے کرلیں اس کمیشن کا پورا خرچ میری حکومت برداشت کرے گی۔

میں نے اس خط کے خاص خاص حصوں کو خود اعلیحضرت کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص اسکو پڑھکر اسکی معقولیت کا خود اندازہ کرے اعلیحضرت نے حکومت ہند کی اختیار کی ہوئی غلط پوزیشن پر جو اعتراضات کئے تھے انہیں کوئی منصف مزاج اور معقول آدمی ناروا اور بیجا نہیں کہہ سکتا اور امور متنازع فیہ کے تصفیہ کی جو صورت حضور ممدوح نے پیش کی تھی وہ بھی نہ صرف معقول و مناسب بلکہ اعلیحضرت کی بہ نسبت خود حکومت ہند کے حق میں زیادہ مفید تھی لیکن اس کا

جو جواب حکومت ہند کے رئیس اعلیٰ نے دیا اس کے متعلق اس سے بہتر کوئی اظہار رائے نہیں ہو سکتا کہ اس کو خود اسی کے الفاظ میں نقل کر دیا جائے۔

لارڈ ریڈنگ اپنے ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میں یور اگزالٹڈ ہائی نس کی پیروی میں اس قضیہ کی تاریخی تفصیلات پر بحث کرنا نہیں چاہتا جیسا کہ میں آپ کو اپنے پہلے خط میں اطلاع دے چکا ہوں آپ کے پیش کردہ امور کی پوری توجہ کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی گئی ہے اور اب جو کچھ آپ فرماتے ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو میری گورنمنٹ اور وزیر ہند کے اخذ کردہ نتائج پر اثر انداز ہوئی ہو..........

"آپ نے بیان کیا ہے کہ حیدر آباد کے داخلی امور میں آپ فرمانروائے ریاست حیدر آباد ہونے کی حیثیت سے وہی درجہ رکھتے ہیں جو برٹش گورنمنٹ کو جہاں تک برطانی ہند کے داخلی امور کا تعلق ہے، ہندوستان میں حاصل ہے .... یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یور اگزالٹڈ ہائی نس اپنے اور دولت عالیہ (Paramount Power) کے تعلقات کے متعلق ایک غلط تصور رکھتے ہیں جسے دور کرنا ہز امپیریل مجسٹی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھ پر لازم ہے کیونکہ اس وقت ایک ایسے مسئلہ میں میری خاموشی کو ممکن ہے کہ بعد میں اس دعوے کے تسلیم کر لینے کا ہم معنی قرار دیا جائے جسے آپ نے پیش کیا ہے تاج برطانیہ کی سیادت ہندوستان میں سب سے برتر ہے اور اس بنا پر کوئی والئی ریاست برٹش گورنمنٹ کے مساویانہ طریق پر گفت و شنید کرنے کا دعوے کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا تاج کی برتری صرف معاہدات اور تمسکات ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ ان سے

بے نیاز ہو کر بھی قائم ہے۔ خارجی دول اور سیاست سے تعلق رکھنے والے
معاملات میں اس کے خصوصی اختیارات سے قطع نظر، برٹش گورنمنٹ کا حق اور
فرض ہے کہ بحزم و احتیاط ان تمام عہود و مواثیق کا احترام کرتے ہوئے جو ہندوستانی
ریاستوں کے ساتھ کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں امن
اور حسن انتظام کو برقرار رکھے اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ اتنے معروف
ہیں، اور دوسرے والیان ریاست کی طرح یور اگزالٹڈ ہائی نس پر
بھی ان کا اطلاق اتنا روشن ہے کہ ان کو بیان کرنا مشکل ہی سے ضروری
معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اگر توضیح کی ضرورت ہو تو میں یور اگزالٹڈ ہائی نس کو
یاد دلاؤں گا کہ ۱۸۶۲ء میں دوسرے والیان ریاست کی طرح فرمانروائے
حیدرآباد کو بھی ایک سند دی گئی تھی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ
ان کے خاندان اور انکی حکومت کے بقاء کی خواہشمند ہے، بشرطیکہ وہ
تاج کے وفادار رہیں اور یہ کہ مسند حیدرآباد پر کسی کی جانشینی اسوقت تک
جائز نہ ہوگی۔ جب تک ہز میجسٹی شہنشاہ معظم اسکو منظور نہ کرلیں نیز جانشینی کے
مسئلہ میں اگر کوئی نزاع برپا ہو تو برٹش گورنمنٹ تنہا اس کا فیصلہ کرے گی۔"

دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں برٹش گورنمنٹ کا حق مداخلت
ان نتائج کی ایک دوسری مثال ہے جو برطانی تاج کی برتری کو لازمی طور پر
متضمن ہیں فی الواقع برٹش گورنمنٹ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ
وہ شدید وجوہ کے بغیر اس حق کو استعمال کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی مگر
وہ داخلی اور خارجی تحفظ جس سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں انجام کار

برٹش گورنمنٹ ہی کی محافظ قوت کے باعث انہیں حاصل ہے اور جہاں
کہیں شاہی مفاد کا تعلق ہو یا کسی ریاست کے طرز عمل سے اس کے
باشندوں کی فلاح و بہبود پر واقعی اور شدید مضرت رساں اثر پڑ رہا ہو
تو حسب ضرورت اس کا تدارک کرنے کی ذمہ داری آخر میں بالاتر قوت ہی پر عائد
ہونی چاہیئے اندرونی حاکمیت (Soverigenty) کے وہ تمام
مدارج جن سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں سب کے سب بالاتر قوت ہی کی
جانب سے اس ذمہ داری کی مناسب انجام دہی کے ساتھ مقید ہیں اس پر ایسی ہی
دوسری مثالوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو مذکورہ بالا مثالوں سے کچھ کم آپ
کی اس رائے کی تغلیط نہیں کرتیں کہ باستثنائے امور متعلق بہ دول و سیاسیات
خارجیہ یوراکزالٹیڈ ہائی نس کی حکومت اور برٹش گورنمنٹ ایک ہی درجہ
مساوات پر قائم ہیں مگر میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں
سمجھتا میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ یوراکزالٹیڈ ہائی نس کو جو "یار وفادار"
کا خطاب حاصل ہے اس کا یہ اثر نہیں ہے کہ تاج برطانیہ کی سیادت میں آپکی
گورنمنٹ کو دوسری ریاستوں سے کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہو"

آپ نے حیدرآباد اور دولت عالیہ کے تعلقات کے متعلق اپنے
موجودہ تصور کی توضیح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ
جن نتائج پر پہنچی ہے ان کو لفظ "فیصلہ" سے تعبیر کرنے میں ہیں نے غلطی کی
ہے نیز یہ کہ قاعدہ "امر فیصل شدہ" کا اطلاق حیدرآباد اور حکومت ہند کے مابین نزاعی
امور میں درست نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یوراکزالٹیڈ ہائی نس کی اس

رائے سے اتفاق نہیں کرسکتا کہ آپکے پیش کردہ امور کے متعلق ذزیر بحث کے احکام ایک "فیصلہ" کی حد تک نہیں پہنچتے، یہ دولت عالیہ کا حق اور امتیازی حق ہے کہ وہ تمام ان نزاعات کا فیصلہ کرے جو دو ریاستوں کے درمیان یا خود اس کے اور کسی ریاست کے درمیان پیدا ہوں اگرچہ خاص خاص حالات میں ایک عدالت ثالثی بھی مقرر کی جاسکتی ہے مگر اس عدالت کا کام بھی صرف اتنا ہی ہے کہ حکومت ہند کو آزادانہ مشورہ دے باقی رہا فیصلہ تو اس کا حق حکومت ہند ہی کو حاصل رہے گا۔

رہا اصطلاح "امر فیصل شدہ" کا استعمال تو یہ میں بھی جانتا ہوں کہ حکومت ہند کے لئے کسی عدالت دیوانی کی طرح اسکی ممانعت نہیں ہے کہ کسی ایسے مسئلہ کی سماعت کرے جو پہلے کسی فیصلہ کا موضوع بن چکا ہو مگر "امر فیصل شدہ" کا قانونی اصول ٹھوس عملی ملحوظات کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کو جس کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو بار بار انہیں فریقین کے درمیان زیر بحث لانا کسی طرح مرغوب نہیں ہے۔

اب میں آپ کی اس درخواست کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ "قضیہ برار کی تحقیقات اور اس پر رپورٹ کرنے کے لئے کمیشن مقرر کیا جائے"۔

یور اکزالٹڈ ہائی نس خود بھی جانتے ہیں کہ اب سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے حکومت ہند نے ایسے مسائل میں عدالت ثالثی مقرر کرنے کے لئے ایک خاص قاعدہ مقرر کیا ہے، جنمیں کوئی ریاست حکومت ہند کے فیصلہ سے مطمئن نہو لیکن اگر آپ اس تحریر کو ملاحظہ کریں گے جو اس جدید انتظام پر مشتمل ہے تو آپ

دیکھیں گے اس میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی گئی ہے جسکی رو سے ایسے
مقدمات میں بھی عدالت ثالثی مقرر کی جا سکتی ہو جن میں خود ہز میجسٹی کی
گورنمنٹ نے فیصلہ صادر کیا ہو کیونکہ میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ایسا مقدمہ
جیسا کہ یہ ہے جسمیں ایک پرانی نزاع کا خاتمہ ایک سمجھوتہ کے ذریعہ کیا جا چکا ہے
اور وہ سمجھوتہ بھی پورے غور و خوض کے بعد ایسی شرائط پر ہوا ہے جو ابہام سے
پاک ہیں ثالثی کی غرض سے پیش کرنے کے لئے موزوں ہو سکتا ہے"

میں نے چند غیر ضروری فقروں کو حذف کر کے یہ پورا خط لفظاً بلفظ نقل
کر دیا ہے تاکہ ہر شخص خود اس کو پڑھکر رائے قائم کر سکے۔ اس میں لارڈ ریڈنگ
نے برار کے اصلی مقدمہ کو اس کے تمام قانونی اور واقعاتی نکات سمیت
نظر انداز کر کے صرف اس امر پر زور دیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بالادست ہے
اور دولت آصفیہ زیر دست، اس لئے اگر بالادست نے زیر دست کا ملک
جبر سے یا حیلہ سے یا کسی طرح چھین لیا تو اب زیر دست کو یہ حق باقی نہیں رہا
کہ اس سے کسی دلیل و حجت کا مطالبہ کرے یا اپنے دعوے استحقاق کو پیش
کر کے اس پر بحث کرے یا کسی عدالت ثالثی کے ذریعے انصاف کرانے کی کوشش
کرے بالادست کو حق ہے کہ بلا دلیل اپنی تائید میں خود فیصلہ صادر کر دے
اور زیر دست کا فرض ہے کہ خواہ وہ مطمئن ہو یا نہ ہو بہر صورت اس فیصلہ کو
تسلیم کر کے دم بخود رہ جائے لارڈ ریڈنگ نے دولت آصفیہ کو ایک ماتحت حکومت ثابت
کرنے کے لئے جو طریق استدلال اختیار کیا ہے اس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت
نہیں اسکی کمزوری تو اسی سے ظاہر ہے کہ تمام معاہدات و عہدنامجات میں

ان کو صرف ایک ۱۸۶۲ء کی سند بل سکی ہے جسکو کھینچ تان کر مشکل یہ معنی پہنائے جاسکتے ہیں کہ داخلی امور میں بھی دولت آصفیہ سلطنت برطانیہ کی تابع ہے حالانکہ ۱۸۰۰ء کا معاہدہ جس پر دولتین کے موجودہ تعلقات قائم ہیں۔ اسکی صاف تردید کر رہا ہے تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ دولت آصفیہ خارجی امور کی طرح داخلی امور میں بھی سلطنت برطانیہ کی تابع ہے۔ تب بھی یہ سوال جوں کا توں رہتا ہے کہ حقوق کے متعلق تنازع فیہ امور میں بالاتری وطاقتوری کی بناء پر "فیصلہ" صادر کرنا اور فیصلہ بھی اس طرح کہ بحث و استدلال کا دروازہ بند کرکے سادہ اور خالص رد و انکار کی شکل میں جواب دیدیا جائے کہاں تک جائز معقول اور اطمینان بخش ہو سکتا ہے اس چیز کو خواہ کتنے ہی پیچ در پیچ اور وکیلانہ انداز بیان میں پیش کیا جائے مگر کوئی صاحب عقل آدمی اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا کہ حق اور انصاف کے معاملہ میں نہ بالادستی استحقاق کی دلیل ہو سکتی ہے اور نہ زیر دستی عدم استحقاق کی، اور خصوصیت کے ساتھ ایسا مقدمہ جس میں مدعی کی شکایات اتنی قوی اتنی مدلل اور اتنی معقول ہوں کبھی اس طرح طے نہیں ہو سکتا کہ بحث تفتیش تحقیقات کچھ نہ ہو اور مدعی علیہ صرف یہ دو حرفی حکم صادر کردے کہ مدعی کا دعویٰ خارج، اگر بفرض محال یہ درست ہے کہ دولت آصفیہ حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں ایک تابعانہ حیثیت رکھتی ہے تب بھی اسکی تابعیت برطانی ہند کے رعایا سے زیادہ ادنیٰ تو نہیں ہے پھر برطانی رعایا کو حکومت کے خلاف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق ہے، اور انگریزی عدالتوں میں

رات دن "تاج" (Crown) کے خلاف دعوے ہوتے رہتے ہیں
تو کیا سلطنت آصفیہ کا تاجدار برطانی رعایا کے معمولی افراد سے بھی گیا گذرا ہے کہ
اس کو ایک آزاد اور غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ اپنی شکایات کے متعلق تحقیقات
کرانے کا حق بھی نہیں مل سکتا؟ فصل خصومات اور تصفیہ نزاعات کا یہ تو کوئی
بھی معقول طریقہ نہیں ہے کہ پہلے ملک پر عارضی قبضہ کیا جائے اس دلیل سے
کہ اگر نہ دوگے تو پونا کی دو رجمنٹیں تم پر حملہ کر دینگی پھر اس عارضی قبضہ پر دوامی
تسلط کا پٹہ حاصل کیا جائے اس حجت سے کہ ملک تو تمہیں بہرصورت واپس نہ
ملے گا، البتہ اگر تم دوامی پٹہ نہ لکھوگے تو اب تک اس میں سے جو تھوڑا بہت
تمہیں ملتا رہا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا۔ پھر جب اصل حقدار اس ناجائز طریق
ملک گیری پر اعتراض کر کے اپنے جائز دعاوی پیش کرے تو اس کو یہ کہکر
خاموش کر دیا جائے کہ ہماری قوت تم سے بالاتر ہے اور ہم یہ فیصلہ کر چکے
ہیں کہ تمہارے ملک کو واپس نہ کریں گے اس لئے تم کو یہ فیصلہ بے چون وچرا تسلیم
کرنا چاہئے! یہ طریقہ برسر جنگ دشمنوں کے ساتھ اختیار کیا جائے تو چنداں
قابل تعجب نہیں مگر دوستوں کے ساتھ اور دوست بھی وہ جو مصیبت کے
وقت جان کی جان اور روپے کی جگہ روپیہ قربان کرنے میں دریغ نہ کرتے
ہوں اسے استعمال کرنا حق و انصاف ہی کا نہیں بلکہ انسانیت و شرافت
کا بھی خون کرنا ہے۔

سلطنت برطانیہ خود بھی اپنے اس جواب کی غیر معقولیت کو سمجھتی ہے اور
اُسے معلوم ہے کہ اعلیحضرت میر عثمان علیخاں جیسے مضبوط اور بیدار مغز فرمانروا کو

ایسے جوابات سے خاموش کرنا مشکل ہے اس لئے اس نے انکے دعوے کو رد کرنے کے ساتھ ہی انہیں خاموش کرنے کا بالواسطہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ اعلیحضرت کیلئے خود ان کے ملک میں داخلی مشکلات پیدا کرنی شروع کردیں، وہی دولت آصفیہ جو اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء سے پہلے تک تمام نقائص سے مبرا تھی، اور جسے نومبر سنہ ۱۹۲۳ء میں خود لارڈ ریڈنگ نے یہ سرٹیفکٹ عطا کیا تھا کہ اس کا نظم و نسق نہایت عمدہ اور قابل اطمینان ہے۔ استرداد برار کا مطالبہ کرتے ہی اس میں ہزاروں عیوب نکلنے شروع ہوگئے۔ اس کی رعایا سے اس کے جاگیرداروں سے اسکے امراء واعیان سلطنت سے اسکی پائیگاہوں سے غرض اسکی رعیت کے تمام طبقوں سے برٹش گورنمنٹ کو گہری ہمدردی پیدا ہوگئی اس کے فرمانروا کے انتظامی معاملات ہی نہیں بلکہ ذاتی معاملات تک نکتہ چینی و حرف گیری کے قابل ہوگئے اور اس امر کی شدید ضرورت پیش آگئی کہ دولت عالیہ اس کے داخلی امور کی اصلاح کے لئے مداخلت کرے، استرداد برار کا مطالبہ کرنے سے پہلے تک ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی وہاں نہ تھی اور اصلاح امور کے لئے مداخلت کرنا بھی برٹش گورنمنٹ کے فرائض سے خارج تھا لیکن یہ مطالبہ کچھ ایسا منحوس نکلا کہ اعلیحضرت میر عثمان علیخاں کی زبان سے اس کے نکلتے ہی دفعتہً ہزاروں خرابیوں اور سینکڑوں عیوب کا دروازہ کھل گیا اور بیچاری حکومت برطانیہ پر اس مطالبہ کو رد کرنے کے ساتھ ہی بیسیوں ایسے فرائض کا بار آن پڑا جن سے وہ پہلے بالکل سبکدوش تھی یہ ڈھنگ ہیں جن سے حق طلبوں کا منہ بند کیا جاتا ہے اور بالاد ست بنکر زیردستوں سے اپنے فیصلے منوائے جاتے ہیں۔

ڈیڑھ صدی کے تعلقات پر ایک نظر

انگریزی حکومت کے ساتھ فرمانروایان سلطنت آصفیہ کے ابتدائی تعلق سے لیکر جدید ترین عہد تک ڈیڑھ صدی سے زائد مدت میں دونوں سلطنتوں کے سیاسی تعلقات کا جو حال رہا ہے اس کو خود انگریزی ذرائع اور زیادہ تر معتبر و مستند سرکاری ریکارڈ کے حوالے سے ان صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اس طویل تاریخی داستان کی تفصیلات کو نظر انداز کر کے اگر اس کا ایک اجمالی خلاصہ نکالا جائے تو وہ ایک جملہ میں اسطرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ۔

"دولت آصفیہ کی جانب سے ہمیشہ وفاداری اور احسان کا برتاؤ کیا گیا اور دولت برطانیہ کی جانب سے اس کا جواب ہمیشہ بیوفائی اور محسن کشی کی شکل میں دیا گیا۔"

۱۷۶۶ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک دونوں کے سیاسی تعلقات کی پوری تاریخ کو پڑھ جائیے آپ دیکھیں گے کہ سلطنت برطانیہ پر کوئی نازک وقت ایسا نہیں آیا ہے جسمیں دولت آصفیہ نے جان و مال سے اسکی مدد نہ کی ہو مگر اس کے ساتھ ہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دولت آصفیہ کے احسانات کا بدلہ اس کو نقصان پہنچا کر نہ دیا گیا ہو۔ نواب میر نظام علیخاں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور اپنی مملکت کی پانچ شمالی سرکاریں اور کڑپہ اور بلاری کے علاقے ان کی نذر کئے مگر اس کا بدلہ یہ ملا کہ ان کی فوج کے بہترین حصہ کو زبردستی منتشر کیا گیا اور مرہٹوں کے ہاتھوں

ان کی سلطنت کو پامال ہوتے دیکھکر انگریزوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک
نہ کی۔ اس کے بعد نواب سکندر جاہ نے پہلی اور دوسری جنگ مرہٹہ میں
انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ انکو خود ان کی
مملکت میں بے بس کر دیا اور ان کے ملازموں سے سازباز کر کے انکی مملکت
کے لئے ہلاکت و بربادی کے تمام سامان مہیا کر دیئے۔ نواب ناصر الدولہ نے
خود اپنے بھائی مبارز الدولہ کو جب کہ ان پر وہابی سازش کا الزام لگایا گیا
تھا، قید کیا، ۱۸۳۵ء ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۹ء میں کرنول اور کومسور وغیرہ کے
خلاف فوجی امداد دی اور انگریزی حکومت کے ناجائز مطالبات پر
بے چوں وچرا لاکھوں روپیہ کنٹنجنٹ کے لئے دیا۔ مگر اس سلوک کے عوض فوجی
دھمکی دے کر ان سے ان کی پوری ریاست کا تیسرا حصہ زبردستی حاصل
کر لیا گیا، نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے غدر کے ہنگامہ
میں انگریزوں کی ایسی اعانت کی جس پر خود وزیر ہند نے انکو وفاداروں
کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس وفاداری کی یہ
قدر کی گئی کہ استرداد برار کے لئے ان کے جائز مطالبات کو پیہم ٹھکرایا گیا
اور آخر میں سالار جنگ کو گرفتاری تک کی دھمکی دیکر زبردستی خاموش کیا
گیا۔ نواب میر محبوب علیخاں مرحوم نے مصر وافغانستان اور روس کے
خلاف مالی اور فوجی امداد پیش کی اور تمام عمر انگریزوں کی وفاداری کا
دم بھرتے رہے مگر ان کو اس کا یہ انعام دیا گیا کہ جب شدید مالی مشکلات
میں مبتلا تھے تو ان کو برار کے منافع سے محروم کر کے اور معاہدات و مواعید

خلاف استرداد برار سے مایوس کرکے اُن سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا گیا آخر میں اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر نے جنگ عظیم میں برطانی سلطنت کے تمام غیر برطانی دوستوں سے زیادہ انکی مالی اور فوجی اعانت کی اور موت و زیست کی کشمکش میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ مگر جب وہ سخت وقت گذر گیا تو ان کے احسانات کا بدلہ یہ دیا گیا کہ برار کے مسئلہ میں ان مطالبات کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ اور اس حق طلبی کی پاداش میں ان کے لئے طرح طرح کی داخلی مشکلات پیدا کرنے کا سامان کیا جاتا رہا ہے۔

اس ایک طرفہ دوستی کی داستان پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو آج سے بہت عرصہ پہلے خود ایک انگلو انڈین اخبار ٹائمز آف انڈیا کرچکا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"نظام دکن کے ساتھ ہمارے تعلقات اس زمانہ سے جبکہ ہم نے ایک محافظ قوت کی حیثیت اختیار کی موجودہ اور زیادہ روشن زمانہ تک ایسے رہے ہیں کہ ان کی تاریخ ہر اس شخص کو جو ہماری قومی سیرت اور دیسی دماغ پر اس کے اثر کو خوب تر دیکھنے کا حریص ہو۔ رنج و افسوس کے ساتھ پڑھنی چاہیئے ہم نے ظاہر تو یہ کیا کہ نظام کے مقبوضات کو خارجی دست برد اور داخلی انتشار سے بچائیں گے۔ ان کی سلامتی کے ضامن رہیں گے۔ اور انکی حالت کو درست کریں گے۔ مگر ہم نے کیا یہ کہ ان کی سلطنت کے صوبے پر صوبے ہضم کرتے چلے گئے۔ درحقیقت ہم نے نظام کو مجبور کرکے اسی ملک کے اقطاع اُن سے جبراً حاصل کئے جس کی حفاظت کی ذمہ داری

لیکن ہم اس کا معاوضہ بھی وصول کر چکے تھے۔ حیدرآباد کے لئے ہماری حمایت بجائے اس کے کہ تحفظ کی ضامن ہوتی الٹی قطع و برید اور دست برد کا ذریعہ بن گئی۔ ایسی حالت میں اس کو حمایت سے موسوم کرنا اس لفظ کا بے محل استعمال ہے۔ ایک سلطنت کا دوسری سلطنت کو اپنی حفاظت میں لینا اور پھر اس حفاظت کے معاوضہ میں اس کے بڑے بڑے اقطاع کو یکے بعد دیگرے سلب کرتے رہنا تا آنکہ وہ "محفوظ" سلطنت گھٹتے گھٹتے اپنی سابقہ عظمت و وسعت کا محض ایک شائبہ رہ جائے اور محافظ سلطنت اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتی چلی جائے ایک ایسی حرکت ہے جس کو لفظ حمایت و حفاظت سے تعبیر کرنا انتہا درجہ کی لغویت ہے اگر یہ نتائج اس نوع کے سیاسی تعلق کے ساتھ ناگزیر ہیں تو ایسی حالت میں اس حمایت کو مفید سمجھنا تو درکنار ہم کہیں گے کہ وہ کھلم کھلا دشمنی سے کچھ کم ہولناک نہیں ہے۔ اگر ہم نظام کو علانیہ جنگ میں شکست دیتے اور فاتح کی حیثیت سے شرائط صلح پیش کرتے تو توسیع ملکات کے سلسلہ میں خواہ وہ کامل الحاق کی شکل میں ہوتی یا ارض مفتوح کے فوجی اختلال کی صورت میں ہم کو شاید اس سے زیادہ ملک ہاتھ نہ آتا جتنا ہم نے دوستی کے خوشی آئندہ مظاہرہ اور پُر فریب حمایت و حفاظت کے پردہ میں حاصل کر لیا۔"[۱]

یہ تبصرہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، جتنا کہ آج سے ۸۰ برس پہلے تھا۔

---

[۱] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۲ ار اکتوبر ۱۸۶۶ء

اس تاریخی داستان کو دہرانے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ جو کچھ زمانہ سابق میں ہوتا رہا ہے، وہی اب بھی ہوتا رہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ سابق میں جو غلطیاں کی گئی ہیں انہیں بیان کر کے ان کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور ان کی تلافی کا مشورہ دیا جائے۔ تاریخ اس لئے نہیں ہے کہ اسکی پیروی کی جائے بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔ اگر کوئی قوم ڈیڑھ سو برس سے حماقتیں اور غلطیاں کر رہی ہو تو ان کے اعادہ کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ اسی ڈگر پر اور زیادہ اصرار کے ساتھ چلتی رہے۔ اگر درحقیقت یہ ثابت ہو جائے کہ اس کے وہ افعال غلط اور غیر معقول تھے تو ہر خردمند انسان کے نزدیک اس کا نتیجہ صرف یہی ہونا چاہئے کہ آئندہ کیلئے وہ ان سے اجتناب کرے، جہاں تک ممکن ہو کھلے دل سے انکی تلافی کرے اور عقل صحیح کی روشنی میں اپنے لئے ایک نئی اور زیادہ بہتر پالیسی اختیار کرے۔ اس طویل مضمون کی تحریر سے میرا مقصد بھی یہی ہے کہ سلطنت برطانیہ کے مدبرین کو یہ مشورہ دوں کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گذشتہ نامۂ اعمال پر ایماندارانہ کے ساتھ ایک نگاہ ڈال لیں اور خود اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ کیا دوستوں اور وفاداروں سے یہی سلوک کیا جانا چاہئے کیا کوئی قوم اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کر کے یہ امید کر سکتی ہے کہ کسی نازک وقت میں کوئی اسکی مدد کرے گا؟ کیا اس طرز عمل سے کوئی قوم اپنے دوستوں کی تعداد میں اضافہ اور دشمنوں کی تعداد میں تخفیف کر سکتی ہے؟ اور کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے برتاؤ سے کوئی قوم دوسری قوموں کی وفاداری، اخلاص اور

محبت کو خرید سکتی ہے؟ اگر اہل برطانیہ کی عقل کا اس حد تک دیوالہ نکل چکا ہے کہ
ان سوالات کا جواب اثبات میں دے تو وہ شوق سے اسی ٹیڑھے راستے پر چلتے
رہیں جس پر چلتے رہے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھنے کے لئے تیار
رہیں جو ایسی حرکات کا قدرتی نتیجہ ہے، لیکن اگر برطانی قوم میں فی الواقع
کچھ ایسے صحیح الفکر ارباب نظر موجود ہیں جو اپنی سلطنت کی غلط پالیسی
کے نتائج سمجھ سکتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اس پالیسی پر نظر ثانی کریں،
اور اپنے دوستوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو انعام و اکرام نہ سہی حق و انصاف
سے جوڑ کر اس وفاداری کا اپنے آپ کو جائز مستحق بنائیں جو ان کے لئے
بڑے بڑے نازک اوقات میں حد درجہ قیمتی ثابت ہوئی ہے۔

مقابل کے صفحات ناظرین کو ہدیۃً پیش کرنے کے لئے چھپوائے
جا چکے تھے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ازراہِ عنایت
انہیں ضمیمہ کتاب بنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اب یہ معاہدہ جو تکمیل کتاب کے لئے ضروری ہے
بطور ضمیمہ اصل کتاب کے ساتھ پیش ہے۔

ناشران

سید علی شبر ہاشمی۔ بی ایس سی عفی عنہ
چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

معاہدہ برار

۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ع

گزارش

ہم نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی مشہور و معروف تالیف "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا ہے۔ یہ کتاب مولانا نے ۱۹۲۸ء میں تالیف فرمائی تھی اور اسی وقت یہ شایع ہوئی تھی۔

چونکہ مصنف کی اجازت کے بغیر کتاب میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے مابین جو معاہدہ مسئلہ برار ۱۹۳۶ء میں ہوا ہے اس کے بغیر کتاب کا مضمون دوسری اشاعت تک مکمل نہیں ہے اس لئے ہم معاہدہ برار ۱۹۳۶ء کو الگ چھاپ کر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد سے دونوں حکومتوں کے مابین کوئی قابل ذکر بات بجز زیر نظر معاہدہ کے طے نہیں پائی اس لئے صرف معاہدہ کا نقل کر دینا کافی ہے۔

محمد اقبال سلیم گاہندری
جولائی ۱۹۴۱ء

سید علی شبر حاشمی
بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

جریدۂ غیر معمولی

بہ حکم عالیجناب مہاراجہ بہادر کشن پرشاد یمین السلطنت بالقابہم
پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

اعلیحضرت مظفر الممالک والممالک فتح جنگ آصف جاہ سابع کے آستان سے
شرف ورود لایا ہوا فرمان نصرت نشان مترشحہ ٢٧ شعبان المعظم ١٣۵۵ ہجری
اطلاع عام کے لئے شائع کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے فقط

حیدر نواز جنگ
صدر المہام متعلقہ امور دستوری

فرمان

میں نے اپنے فرمان مورخہ ١٢ شعبان المعظم ١٣۵٢ھ میں لارڈ ولنگڈن کی
حیدرآباد سے روانگی سے قبل ان انتظامات کے متعلق اپنا اطمینان ظاہر کیا
تھا جو سرکار عظمت مدار کے ساتھ گفت و شنید کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان
میں نئے دستور قائم ہونے پر میرے ملک برار کے آئندہ نظم و نسق کی نسبت عمل
میں آئیں گے۔ اسی فرمان میں میں نے یہ لکھا تھا کہ میری رعایا کو ان تدابیر کے

تفصیلی اعلان کا سخت انتظار رہیگا جن کی رو سے میرے ملک برار کا نظم و نسق ملک معظم کے اس ملک کے ساتھ جو بنام ممالک متوسط موسوم ہے۔ مثل ایک صوبہ واحد کے ہوگا جس کا نام "ممالک متوسط و برار" رہے گا۔ اور برار پر میری سلطنت عملاً اسطرح محفوظ ہوگی کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے گی۔

نیز یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ اور میری گورنمنٹ دونوں کو امید ہے کہ ہندوستان کا دستوری نشو و نما بزودی حکمنہ اعلان مذکور کی اجازت دیگا تاکہ ابواب طے شدہ سے مجھے جو اطمینان حاصل ہوا اس میں میری رعایا بھی شریک ہو سکے۔

چونکہ گفت و شنید اب بحمد اللہ کامیابی کیساتھ اختتام کو پہونچ چکی ہے اور میں نے بتاریخ ۷ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ ہجری مطابق ۲۴ اکٹوبر ۱۹۳۶ء عہد نامہ برار پر جو ملک معظم کے ساتھ ہے دستخط بھی ثبت کر دئے ہیں۔ اس لئے بفضلہ تعالے اب وقت آگیا ہے جبکہ عہد نامہ کی دفعات اور نیز وہ منسلکہ مکتوب جو منجانب ملک معظم بدستخط ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر میرے نام وصول ہوا ہے عوام کی اطلاع کی غرض سے شائع کر دیے جائیں۔

موجودہ عہد نامہ اور اس کے منسلکہ مکتوب کے ذریعہ یہ قدیم تصفیہ طلب مسائل جسطرح طے پائے ہیں نیز معاہدہ ۱۹۰۲ء کی تنسیخ سے مجھے کمال درجہ اطمینان ہوا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس یادگار موقع پر میری عزیز رعایائے حیدرآباد و برار میرے اطمینان و مسرت میں شریک ہوگی میرا یہ فرمان معہ منسلکات جریدہ غیر معمولی کے ذریعہ بغرض اطلاع عام شائع کیا جائے۔

۲۷ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ

شرح دستخط مبارک

معاہدہ

جو آج بتاریخ ۲۴ ماہ اکٹوبر سنہ عیسوی انیس سو چھتیس مابین
ہز مجسٹی ملک معظم شہنشاہ کشور ہند و لفٹننٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ ہائنس
آصف جاہ مظفر الملک والممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب
سر میر عثمان علیخاں بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ
جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای نظام حیدرآباد (دکن) تکمیل پایا۔

ہرگاہ اُن ممالک محروسہ میں جو ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام حیدرآباد کے
اقتدار اعلی کے تحت میں چند علاقہ جات موسوم برار شامل ہیں۔

اور ہرگاہ بذریعہ معاہدہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء یہ قرار پایا تھا کہ ہز اگزالٹیڈ
ہائینس کے علاقہ جات موسوم بنام برار میں جس پر ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اقتدار
اعلی کے متعلق اس معاہدہ میں مکرر اقرار کیا گیا تھا، سرکار عظمت مدار جس طریق
سے مناسب تصور کرے انتظام نظم و نسق عمل میں لائے گی۔

اور ہرگاہ ایک ایسے وفاق ہند کے قیام سے متعلق تجاویز پر
جو مشتمل ہو اُن ریاست ہائے ہند پر جو وفاق مذکور میں شرکت پر رضامند ہوں
اور اُن صوبجات برطانوی ہند پر جو بطور صوبجات خود مختار قائم ہیں

نمائندگان حکومت ہز مجسٹی و پارلیمنٹ سلطنت متحدہ و برطانوی ہند و الیان ریاست ہائے ہیں مباحث ہو چکے ہیں۔

اور ہرگاہ وفاق ہند کے لئے پارلیمنٹ ایک دستور منظور کیا ہے اور وہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء میں مدون کیا جا چکا ہے لیکن اس میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ قانون مذکور کے مختلف حصے مختلف تواریخ سے نافذ کئے جا سکیں گے۔

اور ہرگاہ قانون مذکور کے کسی حکم کا ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے کسی علاقہ پر ان کی رضامندی و اتفاق کے بغیر اطلاق نہ ہوگا۔

اور ہرگاہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء میں اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ مابین ہز مجسٹی اور ہز اگزالٹیڈ ہائینس ایک معاہدہ بدیں غرض طے پانے کی صورت میں صوبہ جات متوسط و برار کا نظم و نسق جب تک کہ ایسا معاہدہ نافذ العمل رہے تحت قانون مذکور بطور ایک گورنر کے صوبہ کے مشترکہ طور پر عمل میں آئے گا۔

اور ہرگاہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اس امر کے خواہشمند ہیں کہ ان کے علاقہ جات موسوم بنام برار کا نظم و نسق بمعیت ان علاقہ جات ہز مجسٹی موسوم بہ صوبہ جات متوسط کے حسب احکام قانون مذکور عمل میں آئے اور وہ بمعیت علاقہ جات مذکور اس وفاق کی جو تحت قانون مذکور قائم ہونے والا ہے ایک وحدت قرار دی جائے اور بدیں غرض یہ قرین مصلحت سمجھا گیا ہے کہ بعوض معاہدہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء

ایک نئے معاہدہ کی تکمیل ہو۔

لہذا اب اس تحریر کے ذریعہ سے حسب ذیل قرار کیجاتی ہے

فقرہ اول۔ ہز مجسٹی برار ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم اور اس کو مکرر فرماتے ہیں۔

فقرہ دوم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اپنی اور اپنے ورثاء اور جانشینوں کی جانب سے بذریعہ ہذا اس امر کا اظہار فرماتے ہیں کہ بمتابعت و مطابقت شرائط مندرجہ معاہدہ ہذا وہ اپنے اُن علاقہ جات کے متعلق جو بنام برار موسوم اور آئندہ تحریر ہذا میں اُسی نام سے مذکور رہیں وفاق ہند میں جو تحت قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء تجویز کیا گیا ہے شرکت پر رضامند ہیں اور ہز مجسٹی بذریعہ ہذا اس رضامندی کی نسبت اپنی قبولیت کا اظہار فرماتے ہیں۔

فقرہ سوم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس اپنی اور اپنے ورثاء اور جانشینوں کی جانب سے بذریعہ ہذا قانون مذکور کے ان احکام کے متعلق جن کا برار پر اطلاق ہو اس غرض سے اظہار قبولیت فرماتے ہیں کہ بمتابعت و مطابقت شرائط معاہدہ ہذا اور باوجود اس کے برار پر ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا اقتدار اعلیٰ برقرار رہے گا برار اور ہز مجسٹی کے وہ علاقہ جات جو صوبہ جات متوسط کے نام سے موسوم ہیں دونوں کا نظم و نسق اس طرح عمل میں آئے کہ گویا وہ ایک ہی صوبہ ہیں جو بنام صوبہ جات متوسط و برار موسوم ہوگا۔ اور ہز مجسٹی اور جملہ وفاقی مرکزی و صوبہ جاتی ادارہ ہائے حکومت

صوبہ جات متوسط و برار کی نسبت وہ تمام اختیارات و فرائض انجام دیں جن کے وہ قانون مذکور کی رو سے یا اس کے تحت حامل ہیں۔

فقرہ چہارم۔ صوبہ جات متوسط و برار کے گورنر کا تقرر منجانب ہز مجسٹی بعد مشورہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس عمل میں آئے گا۔ اور گورنر جو اختیارات و فرائض تحت قانون مذکور منجانب یا بہ نیابت ہز مجسٹی انجام دے سکیں گے وہ برار کی حد تک ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کے بناء پر انجام دئے جائیں گے۔

فقرہ پنجم۔ برار میں جب کبھی اور جہاں کہیں گورنر صوبہ جات متوسط و برار کے احکام کی بناء پر برطانوی پرچم بلند کیا جائے گا تو اس کے پہلو بہ پہلو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا پرچم بھی بلند کیا جائے گا۔

فقرہ ششم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کا یہ حق بذریعہ ہذا تسلیم کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کے اعزازی خطابات باشندگان برار کو عطا فرمائیں بشرطیکہ ہز مجسٹی کے اس قائم مقام کا اتفاق قبل از قبل حاصل کیا جائے جو بہ پاسبانیٔ ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے اختیارات و فرائض انجام دینے کا مجاز ہو۔

فقرہ ہفتم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس حق کو ہز مجسٹی تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ برار میں دربار منعقد فرمائیں بشرطیکہ ہر مرتبہ ہز مجسٹی کے قائم مقام مذکور کا اتفاق حاصل کیا جائے۔

فقرہ ہشتم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو اختیار رہو گا کہ ہز مجسٹی کے قائم مقام

مذکور کے اتفاق سے گورنر صوبہ جات و برار کو موزوں تقاریب میں رسمی شرکت کے لئے حیدرآباد آنے کی دعوت دیں۔

فقرہ نہم۔ برار کی مسجدیں ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے نام سے خطبہ پڑھے جانے پر ہز مجسٹی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

فقرہ دہم۔ باوجود اختتام معاہدہ مذکورہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء ہز مجسٹی سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ جو برار کی بابتہ اس وقت تک ادا ہوتی رہی ہے ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو ادا فرماتے رہیں گے۔

فقرہ یازدہم۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو یہ حق ہوگا کہ صوبہ جات متوسط و برار کے مستقر حکومت میں اپنا ایک ایجنٹ بدیں اغراض قائم رکھیں کہ وہ کسی ایسے معاملہ سے متعلق اپنی حکومت کے خیالات کی نمائندگی کرے جو صوبہ جات متوسط و برار اور حیدرآباد دونوں کے مشترکہ اغراض پر مشتمل ہو یا جو حیدرآباد کے اغراض پر بلا واسطہ موثر ہو۔ لیکن بجز صورت مصرحہ بالا ایجنٹ مذکور کو صوبہ جات متوسط و برار کے کسی داخلی معاملہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

فقرہ دوازدہم۔ گورنر صوبہ جات متوسط و برار نظم و نسق برار میں اپنی اس خاص ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے جو کسی ریاست ہند کے حقوق کی حفاظت سے متعلق ہو ریاست حیدرآباد کے تجارتی و معاشی اغراض کا لحاظ واجب رکھیں گے۔

فقرہ سیزدہم۔ گورنر جنرل کو لازم ہوگا کہ مجالس وضع قوانین صوبجات

متوسط و برار کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جس کا اطلاق برار پر ہوتا ہو اور جو اون کے غور کے لئے مختص کیا گیا ہو ہز مجسٹی کے نام سے اپنی منظوری کا اعلان کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کریں کہ جہاں تک اس کا اطلاق برار پر ہوگا مسودہ قانون کو جو منظور کیا گیا وہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کی بنا پر ہے۔

فقرہ چہاردہم۔ گورنر صوبہ جات متوسط و برار کو لازم ہوگا کہ مجلس وضع قوانین صوبہ جات متوسط و برار کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جس کا اطلاق برار پر ہوتا ہو ہز مجسٹی کے نام سے اپنی منظوری کا اعلان کرتے ہوئے یا اس قسم کے کسی ایسے مسودہ قانون کی نسبت جو ہز مجسٹی کے اظہار پسندیدگی کے لئے محفوظ کیا گیا ہو ہز مجسٹی کی منظوری کرتے ہوئے اس امر کی صراحت کریں کہ جہاں تک اوس کا اطلاق برار پر ہوگا مسودہ قانون کو جو منظور کیا وہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اس معاہدہ کو منظور فرمانے کی بنا پر ہے۔

فقرہ پانزدہم۔ معاہدہ ہذا میں کوئی امر کسی طرح اون فوجی کنٹونمنٹوں پر موثر نہیں ہے اور نہ اون میں تخفیف کرتا ہے جن سے ہز اگزالٹیڈ ہائینس کسی موجودہ عہدنامہ یا معاہدہ کے تحت مستفید ہو رہے ہیں اور معاہدہ ہذا میں کسی امر کی ایسی تعبیر نہ کی جائے گی جس سے فوجی جمعیت موسومہ بنام حیدرآباد کنٹنجنٹ کو یا اوس کے جدید قائم مقام جمعیت کو برقرار رکھنے کے لئے ہز اگزالٹیڈ ہائینس پر آئندہ کوئی ایسی ذمہ داری

جو بتاریخ معاہدہ ہذا موجود عائد کی جائے۔

فقرہ شانزدہم۔ مجلس وضع قوانین صوبہ جات متوسط و برار کے انتخابات کے متعلق اور بعد قیام وفاق انتخابات کونسل آف اسٹیٹ کے متعلق احکام مندرجہ ذیل کے بموجب عمل ہوگا۔

الف۔ جس حد تک کہ رائے دہندوں کی قابلیت کسی امتحان کی کامیابی پر منحصر ہو۔ حیدرآباد کے کسی مساوی درجہ کے امتحان کی کامیابی کا برار کے حلقہ ہائے انتخاب کی نسبت وہی اثر ہوگا جو کسی ایسے امتحان کی کامیابی کا ہوتا ہے جو عموماً صوبہ جات متوسط و برار میں فی الوقت رائے دہندوں کو رائے دہی کے قابل بناتی ہو۔

ب۔ جس حد تک کہ رائے دہندہ کی قابلیت کسی فوج باقاعدہ یا کسی جمعیت پولس میں اوس کی یا کسی اور شخص کی شرکت پر منحصر ہو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے افواج باقاعدہ کی اور جمعیت پولیس ریاست حیدرآباد کی رکنیت برار کے حلقہ ہائے انتخاب کی نسبت ایسی ہی تصور کیجائے گی جیسی کہ علی الترتیب ہز مجسٹی کے افواج باقاعدہ کی اور کسی جمعیت پولس برطانوی ہند کی رکنیت تصور کیجاتی ہو۔

فقرہ ہفدہم۔ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کے حوالجات مندرجہ معاہدہ ہذا کی یہ تعبیر کی جائے گی کہ اُن حوالہ جات کا اطلاق قانون مذکور پر بشمول ایسی جملہ ترمیمات کے ہوگا جو مابعد کے کسی قانون کی رو سے یا اوس کے تحت ہوئی ہوں لیکن اگر کوئی ایسی ترمیم عمل میں آئے

جو اس معاہدہ کی کسی شرط کے متناقض ہو یا جس سے قانون مذکور کے کسی حکم کی مصرحہ ضمیمہ معاہدہ ہذا کی ترمیم ہوتی ہو اور یہ ترمیم ایسی نہ ہو جس کا اثر پر اطلاق ہونا ہز اگزالٹیڈ ہائینس نے منظور فرمایا ہو یا جس کا اطلاق صرف علاقہ جات ماسوائے برار پر ہوتا ہو تو ہز اگزالٹیڈ ہائینس کو اختیار ہوگا کہ تاریخ ترمیم مذکور سے چھ ماہ کے اندر کسی وقت اس بارے میں اطلاع دیکر معاہدہ ہذا کو ختم فرمادیں۔

فقرہ پنج دہم۔ معاہدہ ہذا کو بعوض معاہدہ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۰۲ء نافذ العمل رہے گا۔ اور اس میں بجز رضامندی فریقین کوئی تغیر یا ترمیم نہ ہوسکے گی۔ اور بمتابعت شرائط مندرجہ آخر فقرہ ماسبق کسی ایک فریق کی جانب سے اس وقت ختم نہ کیا جاسکے گا جب تک کہ اس کے محفوظ حقوق فریق ثانی کو پابندی کے ساتھ محفوظ رہیں اور وہ اس تاریخ سے نافذ ہوگا جو حصہ سوم قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کے نفاد کے لئے مقرر کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود تاریخ مذکور کے قبل قانون مذکور بحصہ جات متوسط و برار میں نافذ کرنے کی غرض سے برار میں ایسے تدابیر اختیار کئے جاسکیں گے جن کا قانون مذکور کی رو سے یا اس کے تحت کسی آرڈر ان کونسل رو سے اختیار دیا جائے۔

فقرہ نوازدہم۔ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کی دفعہ (۶) کے احکام کا معاہدہ ہذا پر اطلاق نہ ہوگا اور نہ وفاقی عدالت کا اختیار سماعت کسی ایسی نزاع پر حاوی ہوگا جو اس کے تحت پیدا ہو۔

فقرہ بستم۔ معاہدہ ہذا کا کوئی امر ہز اگزالٹیڈ ہائینس کے اُن حقوق پر جو اُن کے علاقہ جات ماسوائے برار سے متعلق ہوں موثر نہ ہوگا اور بذریعہ ہذا اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ قانون حکومت ہند نافذہ ۱۹۳۵ء کے حصہ دوم کے احکام کی رو سے جس وفاق ہند کی تجویز ہوئی ہے اس میں شرکت کے متعلق خواہ ہز اگزالٹیڈ ہائینس دستاویز کی تکمیل فرمائیں یا نہ فرمائیں۔ اور خواہ ہز مجسٹی ایسی دستاویز قبول فرمائیں نہ فرمائیں بہرحال اقرارنامہ ہذا نافذ العمل رہے گا۔

بہ توثیق امور مصرحہ صدر معاہدہ ہذا پر ہز اکسلنسی دی موسٹ آنریبل دی مارکوئیس آف لن لتھگو۔ پی۔ سی۔ کے۔ ٹی۔ جی۔ ایم۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ ایم۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔ ڈی۔ بل۔ ٹی۔ ڈی نے جو ہز مجسٹی کے وائسرائے اور گورنر جنرل کشور ہند ہیں۔ منجانب ہز مجسٹی اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں اور لفٹننٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ ہائینس آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب سر میر عثمان علیخان بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای نظام حیدرآباد (دکن) اپنے دستخط ثبت فرمائے ہیں۔
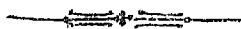
(ضمیمہ ہٰذا میں جہاں صوبہ اور گورنر کا ذکر آئے اس سے صوبجات متوسط و برار اور وہاں کا گورنر مراد ہے۔)

قانون کے حصہ اول کا اس قدر جزو جو ہز مجسٹی سے اور گورنر جنرل سے اور ہز مجسٹی کے اس قائم مقام سے متعلق ہو جو ریاست ہائے ہند سے تاج برطانیہ کے تعلقات کے ضمن میں تاج کے فرائض و اختیارات کے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔

حصہ جات دوم و سوم کے محولہ ذیل احکام۔

دفعہ ۷۔ ضمن (۱) و ضمن (۲)

دفعہ ۹۔ ضمن (۳)

دفعہ ۱۲۔ ضمن (۲)

دفعہ ۱۴۔ ضمن (۱)

دفعات ۲۳۔۴۳۔۴۴۔۴۹۔

دفعہ ۵۰۔ ضمن (۳)

دفعہ ۵۲۔ ضمن (۳)

دفعات ۵۴-۷۵-۷۶-۷۷-۸۹-۹۰-

(جو عام احکام امور ذیل کے متعلق ہیں یعنے صوبہ میں وفاق کے انتظامی اختیار کا استعمال کارروائی منجانب گورنر جنرل یا گورنر بہ لحاظ اُن کے صوابدید کے یا باستعمال اُن کی انفرادی قوت فیصلہ کے وزیر ہند کا گورنر جنرل پر اور گورنر جنرل کا گورنر پر اختیار و نگرانی آرڈیننس جو گورنر جنرل یا گورنر اپنے صوابدید سے نافذ کرے اور گورنر جنرل و گورنر کے نافذ کردہ قوانین

دفعہ ۱۱ ضمن (۱) جس حد تک کہ اُس میں یہ محکوم ہے کہ گورنر جنرل مذا فعت کے معاملات میں اپنے حسب صوابدید عمل کریں۔

دفعات ۱۲ و ۲۵ جس حد تک کہ ان کی رو سے دفعہ (۱۲) ضمن (۱) کے فقرات (اے) و (جی) کی متذکرہ خاص ذمہ داریاں گورنر جنرل پر اور دفعہ ۲۵ ضمن (۱) کے فقرات (اے) (الف) اور (جی) کی متذکرہ خاص ذمہ داریاں نیز وہ خاص ذمہ داری متعلقہ برار متذکرہ ضمن (۲) دفعہ مذکور جو گورنر پر عائد ہوتی ہے۔

دفعہ (۳۸) ضمن (۱) اور دفعہ ۸۴ ضمن (۱) کی متعلقہ شرط کا اس قدر حصہ جس میں گورنر جنرل یا گورنر کے لئے یہ حکم ہے کہ اپنے صوابدید کے لحاظ سے امور ذیل کے متعلق قواعد وضع کرے۔

(الف) متذکرہ بالا خاص ذمہ داریوں کی ادائی سے متعلق وفاقی یا صوبہ جاتی مجلس وضع قوانین کے ضابطہ کارروائی اور طریق کار کو منضبط کرنا۔

(ب) اُن امور پر جو ریاست ہائے ہند سے یا کسی والی ریاست یا

ریاست کے حکمران خاندان کے کسی فرد کی ذاتی روش سے متعلق ہوں بحث کرنے یا سوالات پیش کرنے کی تا بحد محکمہ مہ شرط مذکورہ ممانعت۔

اور دفعہ (۳۸) کے مذکورہ ضمن (۱) کی شرط کا اس قدر حصہ جس میں گورنر جنرل کے لیئے یہ حکم ہے کہ اُن کے حسب صوابدید اس غرض سے قواعد وضع کریں کہ مداخلت سے متعلق وفاقی مجلس وضع قوانین کے ضابطہ کار روائی اور طریق کار کو منضبط کریں اور صوبہ کے معاملات سے متعلق کسی کار روائی پر جو وہ اپنے حسب صوابدید عمل میں لائیں بحث کرنے یا سوالات پیش کرنے کی تا بحد محکومہ شرط مذکور ممانعت کی جائے۔

دفعہ ۴۰ ضمن (۲) اور دفعہ ۸۹ ضمن (۲) جن کے تحت گورنر جنرل یا گورنر مجاز ہیں کہ وفاقی یا صوبہ جاتی مجلس وضع قوانین میں ایسے مباحث پر قیود عاید کریں جو دفعہ ۱۲ ضمن (۱) کے فقرہ (اے) اور دفعہ ۵۲ ضمن (۱) کے فقرہ (اے) کی متذکرہ خاص ذمہ داریوں کی ادائی پر موثر ہوتے ہوں

دفعہ ۷۴ (جو برار سے متعلق ہے)

دفعہ (۱۰۸) جس حد تک کہ اس کی رو سے محکوم ہے کہ ایسے مسودات قوانین یا ترمیمات کی پیشی یا ان کے متعلق تحریک کے لئے اولاً گورنر جنرل کی منظوری ان کے حسب صوابدید یا گورنر کی منظوری ان کے حسب صوابدید حاصل کی جائے۔ جن سے گورنر جنرل یا گورنر کے قوانین یا آرڈیننسز کی جو انھوں نے اپنے حسب صوابدید مشتہر کرائے ہوں تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو یا جو قوانین یا آرڈیننسز مذکور کے مخالف ہوں یا جو مدافعت سے متعلق امور

پر موثر ہوں۔

دفعہ (۱۱۰) باستثناء اُن صورتوں کے جن میں وہ ایسے قوانین کے وضع کرنے سے متعلق ہوتی ہوں جو لا آف برٹش نیشنلیٹی آرمی ایکٹ، ایر فورس ایکٹ، نیول ڈسپلین ایکٹ، لا آف پرائزر آر پرائیزکورٹس پر یا مرافعات مرجوعہ پریوی کونسل باجازت خاص پر موثر ہوں۔

باب اول حصہ نہم جو وفاقی عدالت سے متعلق ہے باستثناء دفعہ (۲۰۶) باب مذکور۔

دفعات ۲۴ و ۶۷۔ دفعہ ۲۲۰ ضمن (۴)۔ دفعہ ۳۱۱ ضمن (۷) اور ضمیمہ چہارم جس حد تک کہ وہ اُن حلقوں اور اقرارات صالح سے متعلق ہیں جو ایسے اشخاص کو اٹھانے یا کرنے ہوں جو برطانوی رعایا نہ ہوں۔

ثبت دستخط
میر عثمان علیخاں

میرے مواجہ میں
ثبت دستخط ڈی۔ جی۔ میکنزی
ریزیڈنٹ متعینہ حیدرآباد
۲۴ر اکٹوبر ۱۹۳۶ء

ثبت دستخط
لن لتھ گو

بخدمت

لفٹنٹ جنرل ہز اگزالٹیڈ ہائنیس آصف جاہ مظفر الملک والممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب میر عثمان علیخاں بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ بی۔ ای نظام حیدرآباد (دکن)

میرے معزز و ذی قدر دوست۔

ہز مجسٹی ملک معظم شہنشاہ کشور ہند کی جانب سے مجھے حکم ہوا ہے کہ کہ درباره معاہدہ جدید مورخہ ۲۴ ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء جو برار کے آئندہ نظم ونسق سے متعلق ہے میں یور اگزالٹیڈ ہائنیس کو اس غرض سے مخاطب کروں کہ صورت حال واضح اور اس طرح آئندہ غلط فہمی کا سد باب ہو جائے۔

ہز مجسٹی نہیں چاہتے کہ معاہدے میں کوئی ایسی چیز درج فرمائیں جس سے اس کے اختتام کے امکان غالب کا تصور پیدا ہو سکے یا بطور اوس کے لازمی نتیجہ کے ایسے تجاویز شریک فرمائیں جو اس صورت میں برار کے مابعد کے انتظام کے لئے ہوں تاہم اس غرض سے کہ شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے، ہز مجسٹی اس امر کی صراحت کر دینا مناسب خیال فرماتے ہیں کہ وہ اس معاہدہ میں اس صاف و صریح سمجھوتہ پر شریک ہو رہے ہیں کہ اگر آئندہ کسی امر کی وجہ سے معاہدہ کا بدقسمتی سے اختتام ہو جائے تو ہز مجسٹی کو اختیار ہوگا کہ ایک نئے معاہدہ کی عدم تکمیل کی صورت میں یا اُس کے تکمیل پا لینے تک، نظم و نسق برار کے لئے باوجود کسی امر کے جو تہد نامہ جا

بابت ۱۸۵۳ء و ۱۸۶۰ء میں اوس کے برخلاف ہو، ایسے انتظامات جو وہ ضروری تصور فرمائیں قائم کریں۔ اور وہاں بلا شرکت غیرے کامل اختیارات استعمال فرمائیں لیکن مجھے یہ واضح کردینے کا حکم ہوا ہے کہ اس سے نہ تو یور اگزالٹیڈ ہائینس کے برابر اقتدار اعلی کا تسلیم کیا جانا۔ نہ سالانہ رقم پچیس لاکھ روپیہ کی ادائی اور نہ کوئی فوجی کفالتیں جن سے اس وقت یور اگزالٹیڈ ہائینس تحت عہدنامہ جات موجودہ مستفید ہو رہے کسی طرح متاثر ہوں گی اور نہ ہز مجسٹی یور اگزالٹیڈ ہائینس کی رضامندی کے بغیر اپنے کو اس کا مجاز تصور فرمائیں گے کہ نظم ونسق برار کے لئے کوئی انتظامات کسی ایسی بنیاد پر قائم کریں جو اس بنیاد سے اصولاً مختلف ہو جو اس وقت قائم ہے۔

یور اگزالٹیڈ ہائینس کی جو اعلیٰ وقعت میرے نزدیک ہے اس کا میں اظہار کرنا چاہتا ہوں اور یور اگزالٹیڈ ہائینس کے مخلص دوست کی حیثیت سے دستخط کرتا ہوں۔

لن لتھ گو
وائسرائے وگورنر جنرل ہند
نئی دہلی۔ مورخہ ۲۶ اکٹوبر ۱۹۳۶ء

حالات حاضرہ کو سمجھنے کے لیے معرکہ آرا تصنیف

جنگ سنہ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی؟

از جناب شیخ رحمٰن بخش صاحب بی۔اے۔ ال ایل بی

جنگ ہو رہی ہے۔ سب کو معلوم ہے لیکن کیوں ہو رہی ہے شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ معلوم کرنے کے لیے سب مضطرب ہیں آپ یقیناً چاہتے ہوں گے ہٹلر کے خطرناک ارادے۔ اس کی سازشیں میونچ کا معاہدہ۔ رہائن لینڈ پر جبریہ قبضہ۔ پولینڈ کی تباہی چیکوں کے خلاف انتظامات۔ یورپ کے اس دیو طلسمی کے ابتدائی مظالم۔ اس کے برسر کار آنے کے اسباب و وجوہ معلوم کریں۔ اگر یہ درست ہے تو آج ہی جنگ سنہ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی ملاحظہ فرمائیے۔

نوٹ:۔ آٹھ نقشے بھی شامل کتاب ہیں جس سے واقعات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

تقاریر
قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر
اُن حیات پرور سیاسی تقاریر کا مجموعہ جنہوں نے
دکن کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی
مملکت آصفیہ اسلامیہ کے
سیاسی مد و جزر کی تاریخ دکن کے اس جادو بیان
مقرر کی زبانی سنئے
ضخامت (۴۰۰) صفحات۔ قیمت صرف (تین روپیہ مجلد)
ملنے کا پتہ
دار الاشاعت سیاسیہ
شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن